

## باب 18

مجھے دروازے پر رکے دیکھ کر سارنگا نے آواز لگائی ”اندرا آ جا ساجن..... یہاں کبھی اپنے ہیں.....“ میں اندر داخل ہوا۔ سامنے ہی نواب دیر الملک اور پاشا صاحب بیٹھے ہوئے تھے۔ پاشا نے مسکرا کر سارنگا کی طرف دیکھا ”آپ نے اس نوجوان کا تعارف نہیں کروایا..... اس سے آپ کا کچھ خاص لگاؤ معلوم ہوتا ہے۔“ سارنگا نے مجھے اپنے پاس بٹھالیا ”ہاں صاحب..... کچھ ایسا ہی اپنا ہے یہ..... پر زمانے سے ذرا خفا خفا سار ہتا ہے.....“ نواب دیر نے مسکرا کر میری طرف دیکھا ”پڑھے لکھے معلوم ہوتے ہو میاں.....“

”جی..... بی اے کا رزلٹ آنے والا ہے میرا.....“ میری بات سن کر نواب صاحب کے چہرے پر ایک عجیب سی چمک لہرائی..... ”رنگا بھائی..... یہ تو مسئلہ گھر میں ہی حل ہوتا معلوم ہو رہا ہے..... آپ اس نوجوان کو کیوں نہیں بھیج دیتے۔ یہ تو آپ کے یہاں کا معلوم بھی نہیں ہوتا۔ لہذا اس پر کسی کے شک کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، اور بہانہ بھی میرے پاس بہت معقول موجود ہے.....“ میں نے حیرت سے پہلے نواب اور پھر سارنگا بھائی کی طرف دیکھا۔ سارنگا ہنس پڑا۔

”نہیں نہیں بڑے صاحب..... یہ واقعی یہاں کا نہیں ہے..... بس مہمان ہے کچھ دن کے لیے اپنے پاس..... پھراڑ جائے گا یہ پنچھی.....“ یہ سن کر نواب صاحب کے چہرے پر مایوسی سی چھا گئی۔ میں نے وضاحت طلب نظروں سے سارنگا کی طرف دیکھا تو سارنگا نے مختصر لفظوں میں مجھے بتایا کہ چونکہ نواب صاحب کی زمرہ دھوپلی کالی کے علاقے میں آتی ہے اس لیے رنگا سرکار کے لیے وہاں براہ راست دخل اندازی کی صورت میں بڑوں کی سینٹ Senate کے سامنے جواب دہی بہت مشکل ہو سکتی ہے۔ لہذا آج شام سے وہ تینوں بیٹھے یہ مشورہ کر رہے تھے کہ اگر کوئی ایسا طریقہ ہو سکے کہ رنگا بھائی کے گروہ کا کوئی مستند شخص بھیجیں بدل کر کسی دوسرے روپ میں زمرہ دھوپلی میں جا کر رہائش اختیار کرے اور درپردہ نواب کے دشمن کی کھوج لگائے تو اس طرح مسئلہ بھی حل ہو جائے گا اور کسی جواب دہی کی نوبت بھی نہیں آئے گی لیکن انہیں بہت سوچ بچار کے بعد بھی ایسا کوئی اڈے سے وابستہ شخص بھائی نہیں دے رہا تھا لیکن رنگا نے مجھے تین مرتبہ شام سے اب تک کیوں یاد کیا تھا۔ میں نے دھیرے سے اس سے پوچھا تو اسے کچھ یاد آیا۔ ”ہاں..... وہ علاقے کا ڈاکٹر ملا تھا۔ اس نے بتایا کہ کوئی نوجوان اسماعیل کے ساتھ مرہم پٹی کروانے اس کے دوا خانے آیا تھا۔ تجھے چوٹ لگی ہے کیا.....“ میں نے گھبرا کر موسیٰ کی طرف دیکھا ”ہاں..... کندھے پر ہلکی سی خراش آگئی تھی۔ اب ٹھیک ہوں.....“

لیکن مجھے لگا کہ جیسے سارنگا میرے جواب سے کچھ خاص مطمئن نہیں ہوا۔

میں نے اس کا دھیان بنانے کے لئے نواب سے سوال کیا۔

”آپ کو وہ شخص اپنے ہاں کس بھیس میں درکار ہے.....“ نواب نے پاشا کی طرف دیکھا ”کچھ بھی..... ایسا کچھ جس سے وہ دشمن اُسے کچھ خاص سمجھ کر چوکتا نہ ہو سکے۔ مثلاً ہماری بیٹی فضلہ کا اتالیق..... فضلہ کی زیادہ تر پردش اس کی ماں کے ہاں ایران میں ہوئی ہے..... ہم بہت دنوں

سے اس کے لئے یہاں کی تہذیب اور تاریخ کا کوئی استاد رکھنے کے بارے میں سوچ رہے ہیں۔۔۔۔۔ بلکہ پاشا صاحب تو دوسرے اخبار میں اشتہار بھی دے چکے ہیں لیکن کوئی بھی کل وقتی بنیادوں پر یہ کام کرنا نہیں چاہتا۔۔۔۔۔ اور جزوقتی بنیاد پر ہم کسی کو رکھنا نہیں چاہتے۔ فقطہ کو اس خطے کی تہذیب اور تاریخ سے بے حد لگاؤ ہے۔۔۔۔۔ میں نے کسی گہری سوچ میں گم رنگا کی طرف دیکھا اور دوسرا سوال کیا ”اخبار میں اشتہار دینے کی صورت میں یہ عمل کتنے دن میں مکمل ہو سکتا ہے۔۔۔۔۔“ پاشا نے کچھ سوچ کر کہا۔ ”پندرہ بیس دن تو لگ ہی جائیں گے۔۔۔۔۔ اور پھر تم جزئیات طے کرنے کے بعد استاد کی زمرہ حویلی میں منتقلی تک سمجھو مہینہ پورا ہو جائے گا۔“ میں نے موسیٰ کی طرف سوال طلب نظروں سے دیکھا۔ اس نے دھیرے سے سر ہلا کر مجھے ”ہاں“ کا اشارہ دیا۔ مطلب وہ دن رات ایک کر کے ایک مہینے کے اندر میری تربیت کا اہم حصہ مکمل کروا سکتا تھا۔ میں نے سارنگا کی طرف اجازت طلب نظروں سے دیکھا اس نے سر ہلایا

”بول کیا بولنا چاہتا ہے۔۔۔۔۔“ میں نے نواب سے کہا ”آپ اخبار میں اتالیق کا اشتہار دے دیں۔۔۔۔۔ پاشا صاحب کی ذمہ داری لگا دیں کہ وہ مجھے کامیاب امیدوار جن لیس جو میں ہوں گا۔ اور پھر میں دکھاوے کے لئے باقاعدہ کسی دوسرے شہر سے زمرہ حویلی میں اتالیق کے طور پر وارد ہو جاؤں گا۔۔۔۔۔“

نواب کی آواز میں جوش تھا ”لیکن ابھی تو تمہارے استاد محترم نے فرمایا کہ تم یہاں کے نہیں ہو۔۔۔۔۔“ ”ہاں۔۔۔۔۔ لیکن یہی بات آپ کے حق میں بھی تو جاتی ہے، کیونکہ اس طرح مجھے کوئی اڈے کے آدمی کی حیثیت سے وہاں شناخت بھی نہیں کر پائے گا۔۔۔۔۔“

رنگا نے مسکراتے ہوئے میری پیٹھ تھپتھپائی۔ ”لیکن پیارے۔۔۔۔۔ اڈے کا کوئی پُرانا چاول چل پائے گا۔ دشمن بڑا گھاگ ہے اور وہاں سب کچھ اٹنا بھی پڑ سکتا ہے۔ تجھے کچھ ہو گیا تو میں تیرے باوا کو کیا جواب دوں گا سا جن میں نے رنگا کو اطمینان دلایا“ ”آپ مطمئن رہیں۔۔۔۔۔ آپ کا امتحان پاس کیے بغیر میں ان کے ہاں نہیں جاؤں گا۔ رنگا بھائی کی سرکار پر کوئی آنچ نہیں آئے گی میرے نام سے۔۔۔۔۔“ سارنگا نے کچھ حیرت سے پہلے مجھے اور پھر موسیٰ کو دیکھا ”لگتا ہے کوئی کھجڑی پک رہی ہے چچا بھتیجے کے درمیان۔ ٹھیک ہے بھئی۔۔۔۔۔ ساج کو آنچ کیا۔۔۔۔۔ پر یاد رکھ۔۔۔۔۔ آگ پر چل کر دکھائے گا تب ہی اجازت ملے گی تجھے۔۔۔۔۔“ میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ نواب صاحب نے خوش ہو کر پاشا سے کہا ”آپ تمام انتظامات کر لیں۔۔۔۔۔ اشتہار ایک آدھ دن میں آ جانا چاہئے۔۔۔۔۔“ کچھ دیر بعد وہ لوگ سارنگا سے اجازت لے کر رخصت ہو گئے۔ ان کے جانے کے بعد رنگا نے ہم سے مزید کوئی سوال نہیں کیا۔ کچھ توقف کے بعد میں نے سارنگا سے وہ سوال بھی پوچھ لیا جو بہت دیر سے میرے ذہن میں کلبلارہا تھا۔ ”لیکن یہ کیا ضروری ہے کہ نواب صاحب کا دشمن بھی ایک ماہ تک انتظار کرے۔۔۔۔۔ وہ اس تیس دنوں کے وقفے میں بھی تو کوئی جان لیوا وار کر سکتا ہے؟“ رنگا نے مسکرا کر موسیٰ کی طرف دیکھا ”دیکھ لیا موسیٰ۔۔۔۔۔ تیرا لاڈلا بھی اب اڈے والوں کی طرح سوچنے لگا ہے۔ لگتا ہے یہاں کا پانی اثر کر رہا ہے۔۔۔۔۔“ موسیٰ بھی ہنس دیا۔ ”نواب صاحب ایک ماہ کے لیے ایران جا رہے ہیں۔ کچھ جدی پشتی زمین داری کے مسئلے بنانے ہیں۔۔۔۔۔ اسی لیے یہ وقفہ وہ کسی استاد کے چناؤ میں لگانا چاہتے ہیں۔۔۔۔۔“

کچھ دیر بعد محفل برخاست ہو گئی اور میں اپنے کمرے میں چلا آیا۔ پھر وہی تنہائی اور پھر وہی یادوں کے آسیب۔۔۔۔۔ دن تو جیسے تیسے کٹ

جاتا تھا مگر یہ کم بخت رات جیسے رک سی جاتی تھی۔ آج شام جب میں نے ناہید کے ہاں اسے دیکھا تھا تب سے جو اک ذرا سا آرام نصیب ہوا تھا وہ بھی شدید بے چینی میں تبدیل ہونے لگا تھا۔ ہم محبت کرنے والے بھی کتنے معصوم ہوتے ہیں۔ چار دن اپنے محبوب کو اپنی نظروں سے اوجھل رکھ کر اور اس سے کوئی بات یا رابطہ نہ کر کے یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ ہم اسے بھلانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ جبکہ حقیقت تو یہ ہے کہ صدیوں اوجھل رہنے کے بعد بھی محبوب کی پہلی جھلک ہمیں ٹھیک اسی مقام پر دھکیل دیتی ہے جہاں سے ہم نے ترک ملاقات کی ابتدا کی ہوتی ہے۔ سچ ہے کہ محبت سے کوئی فرار ممکن ہی نہیں..... شاید محبت بھی موت کا دوسرا نام ہے۔ محبت جان لیوا ہے۔

میں بھی اسی جان کنی کے عالم میں ساری رات اپنے تکیے پر سر پٹکتا رہا، مگر محبت کا اندھا تیر ہمارے خون میں کچھ ایسا زہر چھوڑ جاتا ہے کہ پھر نیند اور خواب جیسی نعمتیں ہمیں کم ہی نصیب ہوتی ہیں۔ صبح موئی کی پہلی دستک پر ہی میں جھٹ سے باہر نکل آیا۔ اس نے غور سے مجھے دیکھا ”لگتا ہے آج رات پھر خود سے لڑتے رہے ہو..... کبھی کبھی تو میں تجھ سے ڈر جاتا ہوں شہزادے..... اتنی آگ اپنے اندر مت جلا کہ دوسرے بھی بھسم ہو جائیں۔“ اس روز سے موئی نے مجھے باقاعدہ ایک ہاتھ میں رکھ کر اور دوسرے ہاتھ میں چاقو دے کر مشق کروائی۔ یہ رسی ہم دونوں کی بانیں کلائی کو جکڑے رہی اور صرف ہمارا دہانہ ہاتھ ہی آزاد رہ کر وار کر سکتا تھا۔ ہم دونوں کے پاس چینیترے بدلنے کے لیے بھی نہایت کم جگہ تھی کیونکہ موئی نے کچی زمین پر سفید چونے سے ڈالا ہوا دائرہ بھی بہت چھوٹا کر دیا تھا۔ اس روز موئی نے مشق ختم ہونے پر فراخ دلی سے میری پیٹھ تھپتھپائی۔

”شاباش..... تو واقعی مہینوں کا کام دنوں میں سیکھ رہا ہے۔ بڑی صفائی آتی جا رہی ہے تیرے ہاتھ کے اندر..... شاید یہ تیرے اندر کی اسی نار کا اثر ہے شہزادے..... تاکام محبت اگر بہت کچھ لے جاتی ہے تو بدلے میں دل جلوں کو کچھ ایسا دے بھی جاتی ہے کہ اگر وہ اپنے آپ کو جھونک دیں تو دنیا فح کر سکتے ہیں.....“

شاید موئی ٹھیک کہہ رہا تھا۔ محبت میں ناکامی ہمیں بیک وقت دو مختلف انتہاؤں کی طرف کھینچتی ہے۔ ایک انجام خود کو اور دنیا کو ترک کر دینے کی صورت میں لگتا ہے جو انسان کو ہمیشہ کے لیے غروب کر دیتا ہے اور وہ پھر سدا کے لیے ایک عضو معطل کی طرح زندگی گزارتا ہے۔ اسے دن رات کا ہوش نہیں رہتا اور وقت اسے گزار دیتا ہے۔ جبکہ دوسری انتہا اس کے اندر کے انسان کو ظلوغ کر دیتی ہے۔ اس کے اندر کا غصہ اور دکھ اور جلن کی کاٹ اسے کچھ ایسا کرنے پر مجبور کر دیتی ہے کہ جس سے وہ دنیا کی نظروں میں آجائے..... چاہے بدنامی کی صورت ہی کسی پر اس کا تذکرہ کسی طور تو اس کے محبوب تک جا پہنچے..... ایسے میں اسے کسی انجام کا خوف یا راہ میں آئی کسی بھی رکاوٹ کی جھجک اپنے مقصد سے روک نہیں پاتی۔

مجھے بھی شاید وہی دوسری انتہا اپنی جانب کھینچ رہی تھی۔ ورنہ خود کو اس جنوں اور اس اذیت میں ڈالے رکھنے کی اور کوئی وجہ مجھے سمجھ نہیں آرہی تھی۔ میری زندگی سے جیسے ایک پل میں ہی تمام خواہشیں، سب منزلیں اور تمام مقاصد ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئے تھے۔ محبت ہمیں اپنوں سے بیگانہ اور غیروں کے معاملے میں بے حس بنا دیتی ہے، مگر میرے اپنے مجھے بھلا کیسے بھول سکتے تھے۔ صبح نوبے کے قریب اسماعیل نے مجھے ریحان کے آنے کی اطلاع دی۔ وہ میرے لیے امی کا پیغام لے کر آیا تھا کہ آج صبح کی گاڑی سے ہمارے شہر سے چالیس کلومیٹر دور قصبے میں رہائش پذیر تایا جان کی مزاج پرسی کے لیے نکل چکے ہیں اور اب ان کی واپسی شام چار بجے تک ہوگی لہذا میں کسی بھی طرح ان سے ملنے آجاؤں۔ ریحان نے



مجھے دھمکی آمیز نظروں سے دیکھا ”دیکھو..... اس دن میں نے تمہاری بات مانی تھی..... لیکن آج اگر تم نے میری بات نہ مانی تو ان سب کے سامنے تمہیں باندھ کر لے جاؤں گا۔“ ریحان کے تیور اور گلے میں بڑا مظہر تیار ہاتھا کہ آج وہ واقعی بچپن کا کھیل دھرانے کے موڈ میں ہے۔ میں نے مسکرا کر اسے دیکھا ”اچھا میرے تھانے دار..... کپڑے بدلنے کی اجازت تو ہے نا.....“ ریحان بھی ہنس دیا۔ میرے دل سے صدا آئی کہ کاش میرا بھائی یونہی سدا ہنستا رہے۔ ”کاش اسے کبھی کسی سے محبت نہ ہو۔“..... ریحان جب مجھے لیے گھر میں داخل ہوا تو برآمدے میں سے برتنوں کی ٹرے اٹھائے گزرتی چھوٹی کے ہاتھ سے سارے برتن گر گئے۔ چند لمحے تو اسے یقین ہی نہیں آیا کہ میں اس کے سامنے صحن میں کھڑا ہوں اور پھر وہ امی کو آواز دیں دیتی ہوئی میری جانب دوڑی۔ امی بھی اس کی آوازیں سن کر ہڑبڑائی ہوئی سی کمرے سے نکل آئیں اور پھر کچھ ہی دیر میں سب جل قتل ہو گیا۔ یہ مائیں اور بہنیں اپنے اندر اتنے آنسو کہاں چھپا رکھتی ہیں۔ بڑی مشکل سے میں نے اور ریحان نے ان دونوں کو چپ کر لیا، لیکن پھر بھی بات بے بات امی کی آنکھ چھلک ہی جاتی تھی۔ انہوں نے مجھے پہلا اور آخری حکم یہی صادر کیا کہ میں فوراً ابا سے معافی مانگ کر گھر واپس آ جاؤں ورنہ وہ مجھے اپنا حق نہیں بخشیں گی..... وغیرہ وغیرہ..... ان ماؤں کے پاس بھی اپنے بچوں کو دھمکانے کے کیسے کیسے گرتے ہیں، لیکن ماں کا سب سے بڑا ہتھیار تو اس کی محبت ہوتی ہے۔ میں بھی اپنی ماں کی دھمکیاں سن کر مسکاتا رہا۔ پھر بڑی مشکل سے میں نے انہیں یقین دلایا کہ میں بہت محفوظ ہاتھوں میں ہوں اور کچھ ایسا کرنا چاہتا ہوں کہ میری بھی ابا کے سامنے کچھ شناخت بن سکے۔ باتوں باتوں میں میں نے نواب صاحب کے ہاں نوکری کی بات بھی ان کے کان میں ڈال دی۔ کیا کریں، ان ماؤں کو بہلانا بھی تو بڑا مشکل ہوتا ہے، اور میری بھولی امی بھی آخر کار بہل ہی گئیں۔ میں نے ان سے وعدہ کیا کہ اگر تین ماہ تک میں خود کو ثابت نہ کر سکا تو جیسا ابا کہیں گے، چپ کر کے وہی کروں گا۔ حتیٰ کہ اسسٹنٹ پروفیسری کے امتحان میں بھی پوری تیاری کر کے بیٹھ جاؤں گا۔ امی نے دوپہر کے کھانے میں ہر چیز میری پسند کی بنائی اور شام چار بجے سے پہلے میں بمشکل اس وعدے پر گھر سے نکل پایا کہ وہ جب بھی ریحان کو مجھے لینے کے لیے بھیجیں گی..... میں ضرور ان سے ملنے آؤں گا۔

محلے کے کپاؤنڈ میں اپنے کسی ساتھی کو نہ پا کر میں نے سکون کا سانس لیا کیونکہ میں ابا کے آنے سے پہلے ہی جلد از جلد کالونی سے نکل جانا چاہتا تھا، اور پھر سڑک پر آ کر میرے قدم سادات محلے کی طرف اٹھ گئے۔ محل میں نے ستارہ سے وعدہ کیا تھا کہ میں ان کے گھر ضرور آؤں گا۔ کچھ وعدوں کا پاس نہ چاہتے ہوئے بھی کرنا پڑتا ہے۔ میں جانتا تھا کہ اس نے میری آمد کا ذکر گھر میں بھی ضرور کیا ہوا۔ سادات محلے کی چوڑی گلی میں مڑتے ہی مجھے ایک اور حیرت کا سامنا کرنا پڑا۔ سامنے کی دوکان سے برقعے میں ملبوس ستارہ اور بڑی سی کالی شال میں لپٹی گہنا نکل رہی تھی۔ میں ابھی اسی شش و پنج میں تھا کہ انہیں آواز دوں یا نہیں کیونکہ یوں سر بازار انہیں پکارنا مجھے محبوب لگ رہا تھا کہ اچانک گلی کے کنارے پر کھڑے چند ادباز لڑکوں نے خواہ مخواہ بات بے بات زور زور سے ہنسنا اور سٹی کی دھن پر کچھ گنگنا شروع کر دیا۔ صاف ظاہر تھا کہ ان کا نشانہ اور مخاطب وہی دونوں تھیں۔ میں نے اتنی دور سے بھی ان دونوں کی چال میں واضح پریشانی کی لڑکھڑاہٹ اور تیزی محسوس کر لی۔ مجبوراً مجھے اوٹ سے نکل کر ان کے سامنے آنا ہی پڑا۔ ”آپ لوگ یہاں..... تنہا..... شیخ صاحب کہاں ہیں.....“ گہنا اور ستارہ کی جیسے جان میں جان آ گئی۔ ”اوہ شکر ہے..... یہ آپ ہیں..... ہم تو ڈر ہی گئے تھے.....“ میں نے پلٹ کر ان نو عمر لڑکوں کی طرف دیکھا۔ شوکی سے جھگڑے کے بعد یہاں کا ہر فرد میری شکل خوب اچھی

طرح پہچانتا تھا۔ وہ مجھے اپنی جانب گھورتے دیکھ کر بوکھلا سے گئے اور جلد بازی میں ایک دوسرے سے ہاتھ ملا کر وہاں سے رفو چکر ہو گئے۔

میں نے ستارہ اور گہنا کو چلنے کا اشارہ کیا "لیکن آپ دونوں یہاں کیا کر رہی ہیں" ستارہ نے نقاب کے پیچھے سے گہنا کو گھورا "یہ سب اسی کی کارستانی ہے۔ میں نے گہنا کو کہا بھی تھا کہ اب قریبی بازار تک گئے ہیں سودا سلف لانے کے لیے۔ وہ آجائیں تو ان کے ساتھ ہی چلیں گے۔ لیکن اس نے تو کسی کی بات نہ ماننے کی قسم کھا رکھی ہے" گہنا بڑی بہن کی ڈانٹ سن کر روہانسی ہو گئی "اچھا آپنی..... اب ڈانٹیں تو نہیں..... پہلے ہی ان بدتمیزوں کی وجہ سے میرا آدھا خون خشک ہو چکا ہے....." میں انہیں ساتھ لیے ان کی گلی میں داخل ہو گیا۔ دروازے پر دستک کے چند لمحوں بعد اندر سے قدموں کی چاپ ابھری۔ گہنا نے دھیرے سے ستارہ سے کہا "لگتا ہے اباجی واپس آ گئے ہیں....."

چند لمحوں بعد دروازہ کھلا اور اس کے پتوں بیچ کسی کا کرخت چہرہ ابھرا۔ اس کو دیکھ کر ستارہ اور گہنا کی جان نکل ہی گئی۔ وہ ریحان سے بڑی عمر کا کوئی نوجوان تھا۔ اس نے چھوٹے ہی شدید غصے میں گہنا اور ستارہ سے پوچھا "تم دونوں اس وقت باہر کیا کر رہی ہو..... اور اب کہاں ہیں.....؟" وہ شیخ صاحب کا بیٹا حمید تھا جو اپنے آبائی مکان کی رکھوالی کے لیے سیلاب زدہ علاقے سے شاید آج ہی واپس آیا تھا۔ ستارہ اور گہنا خوف کے مارے کچھ بول ہی نہیں پائیں۔ اس نے انہیں جھاڑا "اور یہ کون ہے تم لوگوں کے ساتھ.....؟" تم لوگ تو چلو اندر..... تم سے بعد میں بات ہوگی..... وہ دونوں تیزی سے لپکتی جھپکتی گھر کے اندر چلی گئیں۔ حمید نے اب مجھے کڑی نظروں سے گھورا۔ "جی فرمائیے..... کس سے ملنا ہے آپ کو....."

"شیخ صاحب سے..... انہوں نے مجھے یاد کیا تھا..... میرا نام آیا ہے....."

"اچھا.....؟ لیکن اب تو اس وقت گھر پر نہیں ہیں اور آپ ستارہ اور گہنا کے ساتھ ہی آئے ہیں یا یہ صرف محض ایک اتفاق ہے....."

"نہیں..... وہ دونوں مجھے گلی کی ٹکر پر گھر کی طرف آتی ہوئی ملی تھیں..... آپ چاہیں تو اسے اتفاق بھی سمجھ سکتے ہیں....."

حمید کی آنکھوں میں اب بھی بے یقینی کی ایک لہر تیر رہی تھی۔ ایک سخت گیر بھائی کو شاید ایسا برتاؤ ہی کرنا چاہئے تھا۔ میں واپسی کے لیے پلٹا۔ "ٹھیک ہے..... شیخ صاحب آجائیں تو انہیں میرا سلام دیجئے گا..... خدا حافظ" میرے مڑتے ہی شیخ صاحب خود مجھے لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے گلی میں داخل ہوتے نظر آئے۔ وہ مجھے اور حمید کو دروازے پر کھڑا دیکھ کر ہماری جانب لپکے۔ حمید کی آمد کی خبر انہیں بھی نہیں تھی، باپ بیٹا مل چکے تو وہ میری جانب متوجہ ہوئے۔

"ارے آیاں میاں..... تم باہر کیوں کھڑے ہو..... اندر بیٹھ کر باتیں ہوں گی" میرا جی چاہا کہ ان سے کہوں کہ آپ کے فرزند شاید میرے دروازے پر موجودگی سے بھی نالاں ہیں اور آپ مجھے گھر کے اندر لیے جاتے ہیں۔ شیخ صاحب میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے اندر لے گئے اور تمام ملاقات کے دوران حمید کو میرے اب تک کے کارنامے سناتے رہے لیکن میں چائے ختم کرتے ہی معذرت کر کے وہاں سے اٹھ گیا۔ حمید کا برتاؤ شیخ صاحب کے خاندان سے مختلف تھا اور اس کے اندر کی تلخی کو دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ شیخ صاحب جیسے نرم دل باپ کا بیٹا ہے۔

میں سادات محلے سے نکل رہا تھا تب مجھے پہلے دوکاندار نے سلام کیا "آیاں بھیا سلام" میں نے سر ہلا کر جواب دیا تو سامنے ٹھیلے والے نے ہاتھ جوڑ دیے..... "انو بھائی سلام عرض کرتا ہوں....." میں نے کچھ حیرت سے دوبارہ جواب دیا تو ٹکڑ والے پان کے کھوکھے سے پنواڑی

باقاعدہ ہاتھ جوڑتا ہوا باہر نکل آیا۔ ”سلام انو بھائی..... آپ سے ایک عرض تھی.....“ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب لوگ میرا نام کس طرح جانتے ہیں اور مجھے اس قدر عزت و تکریم سے کیوں پکار رہے ہیں۔ پھر اچانک میرے ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا۔ یہ لوگ مجھے اب سارنگ کے توسط سے جانتے ہیں۔ میں اب صرف آیان نہیں رہا..... اس علاقے کا ”بھائی“ بن چکا تھا۔



## قلمکار کلب پاکستان

- ﴿..... اگر آپ میں لکھنے کی صلاحیت ہے اور آپ مختلف موضوعات پر لکھ سکتے ہیں؟
- ☆..... آپ اپنی تحریریں ہمیں روانہ کریں، ہم ان کی نوک پلک سنوا دیں گے۔
- ﴿..... آپ شاعری کرتے ہیں یا مضمون و کہانیاں لکھتے ہیں؟
- ☆..... ہم انہیں مختلف رسائل و جرائد میں شائع کرنے کا اہتمام کریں گے۔
- ﴿..... آپ اپنی تحریروں کو کتابی شکل میں شائع کرانے کے خواہشمند ہیں؟
- ☆..... ہم آپ کی تحریروں کو دیدہ زیب و دلکش انداز میں کتابی شکل میں شائع کرنے کا اہتمام کرتے ہیں۔
- ﴿..... آپ اپنی کتابوں کی مناسب تشہیر کے خواہشمند ہیں؟
- ☆..... ہم آپ کی کتابوں کی تشہیر مختلف جرائد و رسائل میں تبصروں اور تذکروں میں شائع کرنے کا اہتمام کرتے ہیں۔
- ﴿..... اگر آپ اپنی تحریروں کے لیے مختلف اخبارات و رسائل تک رسائی چاہتے ہیں؟
- تو..... ہم آپ کی صلاحیتوں کو مزید نکھارنے کے مواقع دینا چاہتے ہیں۔
- مزید معلومات کے لیے رابطہ کریں۔

ڈاکٹر صابر علی ہاشمی

قلمکار کلب پاکستان

0333 222 1689

qalamkar\_club@yahoo.com



## باب 19

میں اپنی جگہ گم سم ساکڑا تھا اور کچھ ہی دیر میں میرے آس پاس بازار کے دوکانداروں کا جھمگسا اکٹھا ہو چکا تھا۔ ان میں سے ہر کوئی بس اتنا ہی چاہتا تھا کہ میں دو گھڑی اس کی دوکان پر پڑھ جاؤں۔ ان سب کے پاس سارنگا کی سرکار میں پیش کرنے کے قابل کوئی نہ کوئی عرضی یا درخواست تھی۔ جب تک آیان احمد صرف ایک شریف النفس ہیڈ ماسٹر کا بیٹا تھا وہ ان کی نظروں سے اوجھل اور نہایت غیر اہم تھا اور آج جب اسی غریب گھرانے کے آیان کا نام سارنگا کے اڈے کے ساتھ جڑ گیا تھا تو ان سب کے لیے وہ دنیا میں سب سے اہم ہستی بن چکا تھا۔ اسی بازار میں جب میں نے شوکی کو مارا بیٹا تھا تو کوئی میری مدد کو آگے نہیں آیا تھا اور پھر جب اسی بازار میں مجھے ہاتھ جوڑ کر شوکی سے معافی مانگنی پڑی تھی تب بھی یہ سب خاموش تھے، لیکن آج مجھ سے بات کرنا ان کے لیے قابل فخر ہو چکا تھا۔ شاید ہمارے اندر کی اسی منافقت نے اس معاشرے کو اس قدر کمزور اور قابل نفرت جگہ بنا دیا ہے۔

اس علاقے کے دوکانداروں کے لیے میرا یہ احسان ہی کافی تھا کہ اب ان سے کوئی زبردستی ہفتہ وصول نہیں کرتا تھا۔ وہ سارنگا کے ان برائے نام کارندوں کے خوف سے آزاد ہو چکے تھے لیکن وہ نہیں جانتے تھے کہ انہیں اس خوف سے آزاد کرواتے کرواتے خود میں اپنا سب کچھ گروی رکھ چکا تھا۔ میرے ذہن میں موسیٰ کی ایک نصیحت گونجی ”یاد رکھ شہزادے..... اس دنیا میں بس زور کو سلام ہے..... تو زور آور ہو گا تو لوگ تیرے آگے پلکیں بچانے کو بھی تیار ہو جائیں گے..... اور اگر کم زور پڑ گیا تو یہ تجھے روندھتے ہوئے آگے بڑھ جائیں گے.....“

اور آج میں اپنے سامنے اسی ”زور کو سلام“ کا ایک مظاہرہ دیکھ رہا تھا۔ ابا کے خدشات اتنی جلدی حقیقت کا روپ دھار لیں گے۔ یہ میں نے نہیں سوچا تھا۔ انہیں یہی ڈرتا تھا کہ لوگ مجھے اڈے کی وجہ سے جانیں گے اور سلام کریں گے اور آج مجھے پورا بازار سلام کر رہا تھا۔ میں نے بڑی مشکل سے ان سب سے پیچھا چھڑایا کہ جس کو بھی کسی مدد کی ضرورت ہو وہ یعقوب مینشن آجائے۔ اگر وہ حق پر ہوا تو اس کی دادرسی ضرور کی جائے گی، لیکن اس کے لیے انہیں سارنگا سے خود بات کرنی ہوگی۔“

مینشن واپس پہنچ کر بھی میں بہت دیر تک ایک عجیب سی کیفیت سے دوچار رہا۔ ہم لوگ اپنے گھروں کی بند چار دیواریوں میں جن لوگوں کی طاقت کا رونا روتے ہیں اور غلط اختیارات پر انہیں برا بھلا کہتے اور معتب کرتے ہیں، باہر کی کھلی فضا میں ان کے سامنے ہی سرکیوں جھکا دیتے ہیں۔ کیا دنیا کی سب سے بڑی طاقت واقعی ”خوف“ کی طاقت ہوتی ہے.....؟

موسیٰ نے اسی روز سے میری تربیت کو دن کے تین حصوں میں تقسیم کر دیا تھا اب صبح فجر کے بعد دو گھنٹے کی تربیت کے علاوہ مجھے دن گیارہ سے ایک اور پھر شام چار سے سات بجے تک تربیت دی جاتی تھی۔ ناہید کے پرچے شروع ہو چکے تھے لہذا اب اسے ٹیوٹن کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ اب میری تربیت باقی استادوں سے کچھ ڈھکی چھپی بات نہیں رہ گئی تھی مگر پھر بھی وہ اس رہائشی صحن کی طرف آنے سے گریزی کرتے تھے جہاں موسیٰ

مجھے یہ سب سکھا رہا تھا۔

آخر وہ دن بھی آ گیا جب مجھے سارنگا کے سامنے امتحان کے لیے پیش کر دیا گیا۔ وہ شام کی معمول کی مشق کا وقت تھا جس کی نگرانی سارنگا خود کیا کرتا تھا۔ موسیٰ نے جب مجھے احاطے میں چلنے کا کہا تو میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ تربیت اور مشق اگر سب کے درمیان ہو تو انسان کو اپنے قد کاٹھ کا اندازہ بھی ہوتا رہتا ہے، کیونکہ وہ دوسروں کا پیمانہ بھی دیکھ چکا ہوتا ہے مگر میرا مسئلہ یہ تھا کہ میرا اندازہ صرف موسیٰ کی حد تک محدود تھا۔ میں خود کو صرف اس کی نظر میں ہی تولی سکتا تھا کیونکہ اس کے علاوہ میرا آج تک کسی سے سامنا ہی نہیں ہوا تھا۔ لہذا دوسروں کے بارے میں میرے اندازے کا پیمانہ بالکل خالی تھا۔ اب یہ خدا ہی بہتر جانتا تھا کہ میں اڈے کے معیار پر پورا بھی اترتا تھا یا پھر وہی سدا کا بے معیار تھا۔ سارنگا نے مسکرا کر مجھے دیکھا ”اچھا تو موسیٰ کا بیٹھا آ گیا ہے میدان میں..... بھئی واہ..... دیکھیں تجھے کتنا کندن بنایا ہے تیرے استاد نے.....“

سارنگا نے میری پہلی آزمائش پنجہ بازی ہی رکھی۔ شاید وہ سب سے پہلے میری کلائی کا دم خم دیکھنا چاہتا تھا۔ اس پرکھ کے لیے اس نے پھر اسی سینڈو کو میدان میں آنے کا حکم دیا جو مجھے پہلے بھی اس مقابلے میں شکست دے چکا تھا۔ سینڈو مسکراتے ہوئے میرے مقابل آ کر بیٹھ گیا اور اس نے اپنی کہنی تختے پر رکھ دی۔ میں نے اپنی کلائی کا توازن صحیح کیا اور اپنا پنجہ سینڈو کے پنجے سے بھڑا دیا۔ کچھ لمبے تک ہم دونوں کے جڑے ہاتھ اسی مقام پر ساکت تھے رہے اور پھر میں نے سینڈو کی نظر میں پریشانی کی جھلک دیکھی وہ اپنی کلائی کا زور میرے پنجے پر منتقل کرنے کی کوشش میں پسینہ ہو رہا تھا۔ آج بھی ہمارے گرد اسی دن چلتی ہی، بھیر تھی لیکن آج وہ سب دم سادھے یوں خاموش کھڑے یہ مقابلہ دیکھ رہے تھے جیسے ان میں سے کسی کی بھی سرگوشی یہ سارا ظلم توڑ دے گی۔ میں نے چند لمبے سینڈو کی جانب سے کسی تحریک کا انتظار کیا۔ یہ اس کی اڈے پر پنی ہوئی ساکھ کو برقرار رکھنے کے لیے بھی ضروری تھا۔ پھر میں نے موسیٰ کی جانب اجازت طلب نظروں سے دیکھا۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا تو میں نے دوسرے ہی لمبے سینڈو کی کلائی ایک جھٹکے میں گرا دی۔ کچھ دیر تو جھوم کے اندر کھیوں جیسی بھنھنا ہٹ ہوتی رہی اور پھر ایک چیخ و پکار مچ گئی۔ سب لپک لپک کر موسیٰ کو مبارکباد دے رہے تھے اور میرے کاندھے اور بازو سہلا رہے تھے۔ سارنگا نے سینڈو کو ڈانٹا ”دھت تیرے کی..... حرام خور..... سائنڈ کا سائنڈ ہے پر اپنی تو آج کر کر کی کروادی نا.....“ میں نے مسکرا کر سینڈو کی طرف ہاتھ بڑھایا اور اسے کھینچ کر کھڑا کر دیا۔ سینڈو میرے گلے لگ گیا..... ”جج انوبھائی آج بہت عرصے کے بعد ہارنے میں مزہ آیا ہے.....“

سارنگا نے مجھے مسکراتے ہوئے خبردار کیا ”ذرا ٹھہر جا سورا..... ابھی اصل امتحان باقی ہے۔“ اڈے کی روایت کے مطابق دو بند چاقو ایک چاندی کی تھال میں سارنگا کے سامنے لائے گئے۔ اس نے ان دونوں پر ہاتھ رکھ کر گویا مقابلے کی اجازت دے دی۔ ان میں سے ایک چاقو کو میں بخوبی پہچانتا تھا۔ یہ موسیٰ کا وہی چاقو تھا جو اس نے تمام تربیت کے دوران استعمال کیا تھا۔ ماہروں کی بھیڑ میں سے ایک پکی عمر کا شخص سارنگا کے اشارے پر آگے بڑھا۔ میں نے اسے احاطے میں شاگردوں کو تربیت دیتے ہوئے کئی بار دیکھا تھا۔ اس کا نام اشرف تھا۔ رنگا نے اشرف کو آگے بڑھنے کی دعوت دی مگر اس نے ریت کے مطابق اپنے سب سے مضبوط اور مستند شاگرد کو آگے بڑھا دیا۔ میں نے موسیٰ کا چاقو اٹھالیا اور میرے حریف



نے دوسرا چاقو اپنی پھٹکی میں تولی۔ پھر ہم دونوں نے رواج کے مطابق اپنے اپنے چاقو سارنگا کے قدموں میں ڈال دیے۔ یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ ہم سارنگا کو ہی اپنا سب سے بڑا استاد اور گرو مانتے ہیں۔ سارنگا نے پاس بلا کر ہم دونوں کو اپنے انداز میں شاباشی اور دعا دی۔ ہم دونوں نے چاقو اٹھا لیے اور کھلے احاطے میں آگئے۔ کچھ دیر تک میرا حریف چاروں جانب گھوم کر مجھے نظروں ہی نظروں میں تولتا رہا۔ جبکہ میرے ذہن میں موسیٰ کا ایک ہی جملہ گردش کر رہا تھا کہ اگر سامنے والے کی طاقت اور چال کا اندازہ نہ ہو تو اپنے دونوں پیروں پر اپنا بوجھ برقرار رکھو اور صرف اس کی نظر پڑھتے رہو۔ میں نے بھی یہی کیا اور کھڑے کھڑے اپنے حریف کی حرکت کے ساتھ گھومتا رہا۔ میرے مقابل نے میرا دھیان بنانے کے لیے اپنے چاقو کو تیزی سے ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں منتقل کرنا شروع کر دیا۔ اس کے اندر واقعی بجلی بھری ہوئی تھی لیکن میری نگاہیں اس کے ہوا میں ادھر سے ادھر منتقل ہوتے چاقو کے پھل سے زیادہ اس کی آنکھوں کی پتلیوں پر لگی ہوئی تھیں۔ فضا میں چاقو کی دھار کی چمک سورج کی ایک کرن سے ٹکرا کر منعکس ہو رہی تھی اور میرے لیے حریف کی چال پر نظر رکھنا مشکل ہوتا جا رہا تھا۔ تبھی میں نے دکھاوے کی خاطر ایک بل کے لیے اپنی آنکھیں موندھ لیں اور میرا حریف اسے میری بھول سمجھ کر میری جانب لپکا، لیکن یہ خود اس کی اپنی چوک ثابت ہوئی مجھے ایسے ہی کسی لمحے کے ہزارویں حصے کا انتظار تھا۔ میں نے ذرا سا پہلو بدلا اور دوسرے ہی لمحے حریف کی داہنی کلائی میرے بائیں ہاتھ کے پنجے میں جکڑی جا چکی تھی۔ اس نے بوکھلا کر ہاتھ چھڑانے کے لیے زور سے کھینچا اور میں نے ایک دم اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ وہ ذرا سا لڑکھڑایا اور اگلے ہی بل میرا چاقو اس کی شررگ کو چھو رہا تھا۔ میں نے اس کے لڑکھڑانے کے دوران بائیں ہاتھ سے اس کے شانے کے اندر سے ہاتھ ڈال کر اسے جکڑ لیا تھا اور میرے داہنے ہاتھ میں پکڑا چاقو اب اس کی گردن پر تھا۔ میں نے حریف کو آڑا کر دیا اور مقابلہ ختم ہو گیا۔ رنگا دونوں ہاتھوں سے تالیاں پیٹتے ہوئے جوش میں چلایا..... ”واہ سا جن..... موسیٰ کی جوانی یاد دلا دی.....“ موسیٰ نے آگے بڑھ کر میرا ہاتھ چوم لیا۔ میں نے اڑے کے سب سے مشاق چاقو باز کو بہت کم وقت میں مات دے دی تھی۔

رنگا نے اشرف استاد کو آگے بڑھنے کا اشارہ کیا۔ اشرف استاد چاقو تھامے زمین پر لگے چوٹے کے دائرے میں آکر کھڑا ہو گیا۔ ہم دونوں کے بائیں ہاتھ کی کلائی کو رسی سے باندھ دیا گیا اور صرف داہنے ہاتھ کو آزاد رہنے دیا گیا۔ اب ہم میں سے جس کا قدم بھی دائرے سے باہر نکل جاتا وہ مقابلہ ہار جاتا۔ اشرف استاد داڑے کے پرانے استادوں میں سے ایک تھا، اور اس کی یہاں بڑی دھاک تھی۔ ہم دونوں کچھ دیر تک نظروں نظروں میں ایک دوسرے کو تولتے رہے اور پھر اشرف نے جھکا دینے کے لیے اپنا چاقو ہوا میں اچھالا۔ ٹھیک اسی لمحے اس نے رسی کو ایک زوردار جھٹکا دیا اور اگر میری نظر ہوا میں اچھلے چاقو کی طرف ہوتی تو میں ضرور اوندھے منہ دائرے سے باہر جا کر تاجر میں نے چاقو کی طرف دیکھنے کی غلطی نہیں کی۔ اشرف نے دوسرے ہی لمحے بازی گروں جیسی پھرتی کے ساتھ اپنا ہوا میں اچھالا چاقو پھر سے پکڑ لیا اور دھیرے سے مجھے داد دی ”شاباش جوان..... یونہی ڈٹے رہنا.....“ میں نے دائیں ہاتھ سے ہی چاقو اچھال کر تولی اور بنا کسی منصوبے کو ظاہر کیے رسی کو تیزی سے اپنی کلائی کے گرد دو بل دے کر اپنے اور اشرف کے درمیان فاصلہ کم کرتے ہوئے چاقو کی نوک سے اشرف کے بازو پر وار کیا لیکن یہ دھیان رکھا کہ میرے چاقو کی نوک اس کے بازو کے گوشت کو چھو نہ پائے اور صرف اس کے کرتے کو ہی گزند پہنچے۔ میرا اندازہ ٹھیک رہا اور اشرف کے بازو پر کرتا کٹ کر ایک جانب کو جھول گیا۔ مجھے میں ایک تیزی قحیر آمیز سرگوشی ابھری..... میرا مقصد پورا ہو گیا تھا، میں نے رسی ڈھیلی کرتے ہوئے خود ہی دائرے سے باہر قدم رکھ دیا۔

میں نے اشرف استاد کے آگے اپنی ہار خود تسلیم کر لی تھی۔ سب ہی کو سانپ سوگھ گیا اور پھر سب سے پہلے اشرف استاد نے ہی اپنا چاقو پھینک کر مجھے گلے لگا لیا۔ فضا سیٹوں، تالیوں اور نعروں کے شور سے گونج اٹھی۔ میں نے خود کو ایک استاد کے سامنے مقابلے کے لیے پیش تو کر دیا تھا کہ یہ موسیٰ کی عزت کا سوال تھا مگر موسیٰ کے دیے ہوئے فن کی ایک جھلک دکھا کر میں نے خود کو مقابلے سے دست بردار کر کے اس استاد کی سالوں کی محنت کا مان بھی رکھ لیا تھا۔

موسیٰ نے مجھے دونوں بازوؤں میں اوپر اٹھا لیا۔ ”تو نے آج موسیٰ کو خرید لیا ہے شہزادے..... جیتا رہ.....“

سارنگا نے قریب آ کر اپنے دونوں ہاتھ میرے شانوں پر رکھ دیے۔ ”مارڈالاجنا..... رنگا کو مار ڈالا آج تو نے..... ہر ریتی رواج پکی طرح سیکھ کر اترا ہے آج تو میدان میں.....“ رنگا نے آگے بڑھ کر موسیٰ کو سینے سے لگا لیا اور اس کے ہاتھ کی پشت پر ایک بوسہ دیا ”تیرے ہاتھ میں آج بھی جادو ہے موسیٰ“ موسیٰ نے عقیدت سے رنگا کے ہاتھوں کو اپنی آنکھوں پر لگا لیا۔ ”سب آپ سے ہی سیکھا ہے مالک.....“

سارنگا نے اپنی سونے کی چین گلے سے اتاری اور میرے گلے میں ڈال دی۔ ہجوم نے خوشی سے نعرے لگائے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ سارنگا نے مجھے اپنے اڈے کا مستند اور ماہر تسلیم کر لیا اور اسی خوشی میں اس رات سارنگا کی طرف علاقے کے تمام استادوں، اپنے احاطے کے تمام شاگردوں اور ارد گرد کے سارے اڈے کے لوگوں کو رات کے بڑے کھانے کی دعوت دی گئی، اور اسی رات مجھے پتہ چلا کہ آس پاس کے تمام بڑے لیڈر اور سیاستدان بھی رنگا کی طرف سے دی گئی اس دعوت میں شریک تھے۔ طاقت کی اس شطرنج پر مجھے تمام مہرے آج اس محفل میں موجود تھے۔ آج مجھے سارنگا کی اصل طاقت کا راز بھی پتہ چل گیا تھا ”سیاست“ سیاست دان رنگا کی طاقت کا سہارا لے کر اوپر آتے تھے اور لوگوں پر راج کرتے تھے، لیکن ان کا یہ راج رنگا کی طاقت کا مرہون منت تھا۔

اس رات رنگا نے میرا تعارف ایسے لوگوں سے بھی کروایا جن سے ہیڈ ماسٹر تو قیصر احمد کے بیٹے آیا ان کی حیثیت سے ملنے کے لیے شاید ایک جنم بھر کا انتظار بھی کافی نہ ہوتا، لیکن آج وہ لوگ خود آگے بڑھ کر مجھ سے مل رہے تھے۔ فلم، ٹی وی، سیاست، تجارت، ثقافت..... غرض کون سا شعبہ تھا جس کے لوگ اس دعوت میں شریک نہیں تھے۔ دن کی روشنی میں یہ لوگ اڈے اور اس سے وابستہ لوگوں کو برا بھلا کہتے تھے اور حکومت سے مطالبے کرتے تھے کہ شہر کے امن و امان کو قائم رکھنے کے لیے ایسے زیر زمین اڈوں کا خاتمہ کیا جائے، لیکن رات کے اندھیرے میں یہ لوگ اس زیر زمین سرکار سے اپنی وابستگی ظاہر کرنے کے لیے چہروں پر مسکراہٹ سجائے۔ اس محفل میں چلے آ رہے تھے۔ میں نے دعوت میں بعض پولیس افسران کو بھی دیکھا جو سادہ لباس میں خوش گپیاں کر رہے تھے۔ اس رات نہ جانے کیوں مجھے رنگا اور اس کے ساتھیوں کا قد ان سب ہونوں کے مقابلے میں بہت اونچا لگا۔ کم سے کم وہ ان سب کی طرح منافق تو نہیں تھے۔ وہ جو تھے، سب کے سامنے تھے۔ برے تھے یا بھلے تھے مگر سچے تھے۔ چھپ کر وار نہیں کرتے تھے۔ کھلے دل کے تھے۔ خوشی کو خوشی اور غم کو غم کی طرح مناتے تھے۔

میں بھی باقی بھیڑ کو چھوڑ کر صرف موسیٰ کے آس پاس ہی موجود رہا چاکل مجھے ایک گوشے میں شوکی اپنے دوستوں کے ساتھ دبا سا کھڑا نظر آیا۔ میں ایک دم ہی اس کے سامنے جا کھڑا ہوا تو کچھ بل کے لیے مجھے دیکھ کر وہ بالکل ہی ہکا بکا سا رہ گیا۔ یقیناً اسے بھی دگمراڑے والوں کی

طرح دعوت پر بلوایا گیا ہوگا مگر شاید وہ میری وجہ سے سب کے سامنے آنے سے کترار ہاتھ۔ میری زندگی کا رخ بدلنے میں اس لڑکے کا بہت بڑا ہاتھ تھا۔ میں گھر سے بے گھر ہوا اور آج آیان احمد سے انو بھائی بن چکا تھا۔ سارنگا کے خاص آدمی کی حیثیت سے شوکی جیسے سینکڑوں کارکن آج کے بعد میرے ایک اشارے کے منتظر ہوں گے لیکن شاید یہی میری تقدیر تھی۔ شوکی تو اس بے رحم تقدیر کا ایک کم زور سامبرہ تھا۔ مجھے شوکی کے سامنے کھڑے اور سید تانے دیکھ کر اس پاس اڈے کے لوگوں میں بے چینی سی پھیل گئی۔ شاید وہ اتنی بڑی محفل میں میری جانب سے کسی بد مزگی کے خیال سے سراسیمہ ہو گئے تھے۔

موسیٰ جو مجھ سے کچھ فاصلے پر تھا اس نے بھی پہلو بدلا۔ کچھ دیر تک میں شوکی کی آنکھوں میں دیکھتا رہا اور وہ سر جھکائے آنکھیں چراتا رہا۔ پھر میں نے اپنا دایاں ہاتھ اس کی طرف بڑھا دیا۔ شوکی کو کچھ دیر تک تو میرا دوستی کے لیے بڑھایا ہوا ہاتھ دیکھ کر یقین نہیں آیا۔ پھر اس کی آنکھیں بھرا آئیں اور اس نے مضبوطی سے میرا ہاتھ تھام لیا۔ سب کے چہروں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ میں نے شوکی سے پوچھا ”اب تو رنگا بھائی کے نام پر بہت اکٹھا نہیں کرتے“ اس نے کانوں کو ہاتھ لگایا ”نہیں انو بھائی..... میرے بزرگوں کی بھی تو بہ.....“ میں، شوکی اور اس کے دوست سبھی ہنس پڑے۔ رات گزری تو صبح میں نے رنگا سے زمر دھولی جانے کی اجازت مانگ لی۔ ”میں نے آپ کی شرط پوری کر دی۔ اب مجھے بھی آپ کے لیے کچھ کرنے کی اجازت دے دیں..... میرے لیے تو آپ لوگوں نے بہت کچھ کر لیا..... میں نواب کے دشمن کو پکڑ کر آپ کے محسن ابراہیم کا کچھ قرض اتارنا چاہتا ہوں.....“

سارنگا نے غور سے میری جانب دیکھا۔ موسیٰ بھی اس کے قریب ہی کھڑا تھا۔ ”کبھی کبھی تو تو اپنا ہی کوئی جہنم جایا لگتا ہے..... ٹھیک ہے۔ جا چلا جازمرد دھولی..... تیرا رب را کھا.....“



## ایمان کا سفر

محی الدین نواب کی نشر سے حیر معاشرتی کہانیوں کا مجموعہ..... ایمان کا سفر..... خوبصورت نقابوں کے پیچھے گھٹاؤ نے چہروں کو بے نقاب کرتی..... ہمارے اپنے معاشرے میں بکھرے ہوئے اچھے برے کرداروں کی کہانیاں..... کہانیوں کا یہ مجموعہ کتاب گھر کے معاشرتی کہانیاں / افسانے نمکشن میں دستیاب ہے۔



## باب 20

میں اس وقت اپنے شہر سے پینتیس 35 کلومیٹر دور مضافات میں واقع اس چھوٹے سے ویران ریلوے اسٹیشن پر کھڑا تھا جہاں سے مجھے کمال پاشا لینے آیا تھا۔ زمر دھوپیلی ہمارے شہر کی حدود سے باہر لیکن ایک ہی ضلع کی حدود میں آتی تھی۔ میرا حلیہ اس وقت کسی یونیورسٹی سے تازہ تازہ ماسٹر کر کے نکلے اتالیق جیسا ہی تھا۔ سادہ سا کرتا شلوار، کرتے کے اوپر کالی واسکٹ اور واسکٹ کے جیب میں لگے چند پین..... ہاتھ میں فلسفے کی ایک مشہور کتاب اور سوٹ کیس میں تاریخ اور سوشالوجی کی بہت سی کتابیں..... میں پاشا صاحب کے دیے گئے اشتہار کی تمام شرائط پوری کرنے کے بعد اور زمر دھوپیلی کے بوڑھے میجر کے ذریعے لیے گئے انٹرویو میں پاس ہونے کے بعد باقاعدہ نوکری کے لیے یہاں پہنچا تھا۔

اوائل دسمبر کی خشک ہوا دھیرے دھیرے میرے وجود کے ریشوں کو کاٹنے لگی تھی۔ گاڑی کو مجھے اسٹیشن پر اتارے اور پلیٹ فارم پر چھوڑے آدھے گھنٹے سے زیادہ ہو چکا تھا، لیکن نواب صاحب کے ہاں سے ابھی تک کوئی مجھے لینے کے لیے اسٹیشن نہیں پہنچا تھا۔ اسٹیشن کے آس پاس دور دور تک کھیت پھیلے ہوئے تھے اور مغرب کی جانب والی اونچی پہاڑی کی چوٹی پر سورج کی سنہری کرنوں کا تاج سا بنا ہوا تھا۔ سورج ڈوبتے وقت کتنا مہربان ہو جاتا ہے۔ شاید ہر غروب ہوتی ہوئی شے اپنے کیے کی تلافی کرنا چاہتی ہے۔ اس رویے کی تلافی جو اس نے طلوع ہونے کے بعد اپنے عروج کے دور میں روار کھا ہے۔ کافی دیر کھڑے رہنے کے بعد جب میری گرم سانس باقاعدہ بھاپ بن کر ڈھلتی شام کے دھوئیں میں مدغم ہونے لگی تو میں نے پلیٹ فارم پر نصب ویسٹرن ریلوے (WR) کی مہر والے اور عام سائز سے دو گئے نیالے پیلے رنگ کے بیچ پر اپنا سوٹ کیس رکھ کر اسی سے ٹیک لگالیا۔

اور پھر کچھ دیر بعد میں نے دور اسٹیشن کی طرف پگھلنے والی پر سنہری دھول اڑتے ہوئے دیکھی۔ پرانے ماڈل کی ایک رولز راس کار جو اب ہمارے ملک میں چند گنے چنے نوابوں کے پاس ہی رہ گئی تھی۔ اپنے باوردی ڈرائیور کے ساتھ دوڑتی چلی آ رہی تھی۔ پیچھے کمال پاشا صاحب بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ گاڑی تیزی سے موڑ کاٹ کر اسٹیشن کے بیرونی دروازے کے قریب رک گئی۔ میں نے اپنا سامان اٹھا لیا۔ پاشا صاحب نے آتے ہی معذرت کی۔ معاف کرنا مایاں..... یہاں ریلوے کراسنگ پر پھانک نہیں ہے اور ٹرین بھی عین اسی وقت وہیں کھیتوں میں سے گزرتی کراسنگ پر آ کر انک لگتی تھی۔ لہذا دیر ہوگئی..... ویسے اسٹیشن سے نظارہ بہت خوب دیکھنے کو ملتا ہے۔ میں اور نواب صاحب تو جب بھی کچھ فارغ ہوں..... چائے بنوا کر یہیں چلے آتے ہیں۔ بڑا سکون ملتا ہے یہاں.....“

میں نے اپنا سامان اٹھایا اور ان کے ساتھ چل پڑا۔ انہوں نے ڈرائیور کو مدد کرنے کا اشارہ کیا مگر میں نے اسے روک دیا۔ یہ اسٹیشن شہر کے باہر مضافات میں ہونے کے باوجود شہر سے اس قدر قریب تھا کہ یہاں شاز و نادر ہی کوئی ٹرین سے آتا ہوگا۔ کیونکہ سڑک کا راستہ آدھا تھا اور وقت کی بچت کے ساتھ سہولت بھی موجود تھی مگر میں منصوبے کے مطابق جان بوجھ کر ٹرین سے یہاں اترا تھا کیونکہ ہمیں حویلی والوں پر غابر کرنا مقصود تھا کہ میں کسی دور پار کے شہر سے یہاں آیا ہوں اور ہمارا پہلا گواہ یہی ڈرائیور تھا جو پاشا کے ساتھ مجھے لینے کے لیے اسٹیشن آیا تھا۔ پاشا صاحب نے

راستے میں اسے سنانے کے لیے میرے اس فرضی شہزادہاں کے موسم کے بارے میں چند سوالات بھی کیے۔ کچھ ہی دیر میں ہم اسٹیشن کی پگڈنڈی سے ہوتے ہوئے پکی سڑک پر آ گئے اور یہ سڑک ہمیں سیدھی زمر دھوبلی کے دروازے تک لے گئی۔ واقعی سارنگا نے ٹھیک کہا تھا۔ حویلی کی یاتھی پورا محل تھا۔ جس کے سبز سنگ مرمر کے دالانوں اور ستونوں میں کچھ ایسی چٹکی کاری کی گئی تھی کہ دور سے وہ پورا محل ہی زمر دکا بنا ہوا لگتا تھا۔ مرکزی دروازے سے ایک سفید سنگ مرمر کی سڑک سیدھی کار پورج تک جاتی تھی اور سفید سڑک کے دونوں طرف سرو کے درختوں کی قطار موجود تھی۔ جس سے پرے دونوں اطراف گھاس کے بڑے بڑے میدان تھے جن میں جا بجا پھولوں کی کیاریاں، پانی کے نوارے اور چھوٹی چھوٹی ندیاں اور بیٹھنے کے لیے مناسب فاصلوں پر بنی راہداریوں میں سنگ مرمر کے بڑے بڑے خوبصورت تخت نما صلیب رکھے ہوئے تھے۔ طرز تعمیر کی پہلی جھلک ہی مغلوں کے ہاتھ کی گواہی دے رہی تھی۔ مغل ہمارے خطے میں کیسے کیسے شاہکار بنا گئے۔ کاش تاج محل بھی ہماری طرف ہوتا، میں ایسی کئی سوچوں میں ڈوبا ہوا تھا کہ کار حویلی کے پورج میں جا کر رک گئی۔ ستونوں کی لمبائی اتنی اونچی تھی کہ پورج میں ہی تین منزلیں ڈالی جا سکتی تھیں۔ کہتے ہیں ستون اور چھت کی اونچائی قوم کے ظرف کو بھی ظاہر کرتی ہے۔ گویا یہ حویلی بھی کسی اعلیٰ ظرف کے خلیل کا کارنامہ تھی۔

ہم پورج سے مرکزی ہال میں داخل ہوئے تو ایک بار پھر سے کسی مغل شہزادے کے محل کا تصور تازہ ہو گیا۔ آج تک میں نے ایسے وسیع دربار نما ہال اور اونچی بالکندیاں صرف تاریخی فلموں میں ہی دیکھی تھیں۔ جھروکے، ریشمی لہلہاتے پردے، مردان خانے، زنان خانے، دیوان خاص و عام، راہداریاں، روشیں اور غلام گردشیں..... سبھی کچھ تو موجود تھا اس محل میں۔ کچھ ہی دیر میں نواب صاحب بھی پہنچ گئے اور بڑی گرم جوشی سے مجھ سے ملے۔ یہ مردان خانے کا حصہ تھا جس میں ہم ابھی موجود تھے۔ بیگمات کے لیے زنان خانہ مخصوص تھا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا کہ شہر کی تیز اور بھاگ دوڑ والی زندگی کو ایک دم ہی جیسے بریک سی لگ گئی ہو۔ جیسے کسی ماڈرن سائنس فکشن فلم کے دوران اچانک ہی چالیس یا پچاس کی دھائی کی کوئی ریل جڑ گئی ہو۔ یہاں وقت بھی کتنی آہستگی سے گزرتا تھا۔ میں نے اوپر لگے گھڑیاں پر نظر ڈالی۔ ابھی مجھے یہاں پہنچنے صرف ایک گھنٹہ ہی ہوا تھا لیکن مجھے یوں لگ رہا تھا کہ پورا مہینہ بیت گیا ہے۔

کچھ ہی دیر میں نوکروں نے کھانا لگنے کی اطلاع دی اور ہم سب مرکزی ہال میں متصل کھانے کے کمرے میں آ گئے جو بذات خود ایک درمیانے ناپ کا ہال ہی تھا۔ کھانے کی میز کافی طویل اور خوان بے شمار تھے۔ کھانے پر نواب کی پہلی بیوی سے ان کے دونوں بیٹے بھی موجود تھے۔ بڑے کا نام وقار اور چھوٹے کا نام سجاد تھا۔ دونوں کے نام کے ساتھ الملک کا لاحقہ بھی جڑا ہوا تھا۔ وقار الملک اور سجاد الملک، لیکن شاید دونوں ہی اس قدیم خاندانی مہر سے بے زار تھے لہذا تعارف کرواتے وقت انہوں نے صرف وقار اور سجاد ہی کہا۔ لاحقہ لگانے کا فریضہ خود نواب دیر الملک ادا کرتے رہے۔ دونوں بھائی ایک دوسرے سے کچھ اکھڑے اکھڑے اور بے زار نظر آئے۔ بڑے والے نے تو در پردہ باپ کو یہ پیغام بھی پہنچا دیا کہ وہ نہیں سمجھتے کہ ان کی سوتیلی بہن کے لیے ایسے کسی استاد یا تالیق کی ضرورت بھی تھی۔ اس نے کون سا ہمیشہ یہاں رہتا ہے..... جہاں بیاہ کر جائے گی وہاں خود ہی سب باتوں سے آشنا ہو جائے گی، لیکن نواب صاحب نے سنی ان سنی کرتے ہوئے اعلان کر دیا کہ اب میری رہائش یہیں مردان خانے کے مہمان کے طور پر ہوگی اور انہوں نے حویلی کے پرانے خادم اور فیجر رحیم کو مہمان خانہ کھولنے اور میری تمام ضرورتوں کا خیال رکھنے کی ہدایت کر دی۔ حویلی کا خانسا ماں اعظم (Chef) شبیر عرف شہین بھی ایک ایسا کردار تھا جس کا آگے چل کر مجھ سے کچھ زیادہ واسطہ پڑنے والا تھا، کیونکہ میرے

کھانے پینے کی ذمہ داری اس کے سر پر ڈالی گئی۔ زمر دھولی کے اصول کے مطابق رات کے کھانے پر سب کو مردان خانے کی کھانے کی میز پر اکٹھا ہونا پڑتا تھا۔ صبح کا ناشتہ اور دوپہر کا کھانا البتہ نواب صاحب زنان خانے میں اپنی ایرانی بیگم اور بیٹی فصد کے ساتھ کرتے تھے۔ یہ ساری تفصیلات مجھے وقفہ وقفہ سے پاشا صاحب کی زبانی مل رہی تھیں۔ وہ خود بھی نواب صاحب کے خاص مہمان کی حیثیت سے مردان خانے میں ہی مقیم تھے، مگر ان کا کمرہ بالائی منزل پر تھا۔ کھانے کے دوران ہی مجھے نواب صاحب کے محافظ خاص نواز علی سے ملنے کا اتفاق بھی ہوا..... وہ ہمہ وقت مجھے نواب صاحب کے آس پاس ہی بھٹکتا دکھائی دیا۔ حتیٰ کہ کھانے کے دوران بھی میں نے اسے باہر کی راہداری میں ٹپکتے اور آس پاس کھانا لاتے لے جاتے نوکروں پر کڑی نظر رکھتے ہوئے دیکھا۔ میرے دل میں ایک اور کھٹکا بھی تھا کہ کہیں نواب کے دونوں بیٹوں میں سے کوئی مجھ سے تاریخ یا تہذیب و ثقافت کے مضمون کی کسی ڈگری کے بارے میں نہ پوچھ لے یا اس بارے میں میری قابلیت جاننے کے لیے کوئی سوال نہ کر بیٹھے۔

ان دونوں کو اپنے باپ سے اپنے روزانہ کے خرچ اور ضرورتوں پر بحث کرنے سے ہی فرصت نہیں ملی لہذا میرے مضمون کی طرف ان کا دھیان کم ہی گیا۔ میں گزشتہ ایک مہینے سے یعقوب مینشن میں چار گھنٹے روزانہ ان مضامین کی دو مستند استادوں سے ٹیوشن لیتا رہتا تھا کیونکہ مجھے انہی مضامین کے بھیس میں زمر دھولی میں اتنا تھا مگر پھر بھی میری معلومات ابھی ابتدائی درجے سے ذرا ہی اوپر کی تھیں۔ سچ تو یہ ہے کہ گزشتہ ایک ماہ میں میں نے اتنا کچھ پڑھا اور رانا کا کر یا د کیا تھا جتنا اب تک میں نے اپنے پورے تعلیمی کیریئر میں نہیں پڑھا تھا۔ عجیب خشک مضامین تھے یہ تاریخ وغیرہ بھی، لیکن مجھے ہر صورت یہاں آنے سے پہلے ان چند موٹی موٹی کتابوں کو گھول کر پنی جانا تھا کیونکہ یہاں میرا واسطہ انہی مضامین کی شائق ایک شاگرد سے پڑنے والا تھا۔ اس تمام تجربے کے دوران مجھے ایک اور سبق بھی ملا کہ صرف کتابیں پڑھ لینے سے اور کم از کم وقت میں انہیں ازبر کر لینے سے انسان کسی علم کو پانہیں سکتا۔ وہ اس عمل سے صرف اپنی یادداشت بڑھا سکتا ہے اور مختلف حوالے سے اپنے ذہن میں ترتیب وار بچھا سکتا ہے۔ اصل علم کتاب سے بھی پرے کی کوئی چیز ہے۔

کھانے کے بعد سبز قوے کا ایک دور چلا اور محفل برخواست ہوگئی۔ شہین مجھے میرے کمرے تک پہنچانے کے لیے آیا۔ اس کا بے حد باتونی ہونا میرے لیے فائدہ مند بھی تھا۔ بہت سی باتیں اس نے مجھے بتا دی تھیں کہ نواب صاحب کی پہلی مرحومہ بیوی اپنی آخری سانس تک نواب صاحب کی ایران میں دوسری شادی کو قبول نہیں کر پائی تھیں۔ جاتے جاتے یہ زہرہ اپنے دونوں بیٹوں کو بھی منحل کر گئیں مگر شوشی قسمت کے دونوں بھائیوں میں خود ہمیشہ ٹھنی ہی رہی۔ بڑا بیٹا وقار قص و سرور کی محفلوں کا دلدادہ تھا اور اس کی شامیں رنگین ہی رہتی تھیں۔ چھوٹے والے سجاد کے شوق البتہ کچھ مردانہ تھے اور وہ بہتوں آس پاس کے جنگلوں میں اپنے خاص نوکروں سمیت شکار کی تلاش میں بھٹکتا رہتا تھا۔ اور اس کی شکاری ہندوق ہمیشہ بھری ہوئی اور جیب ہمیشہ تیار رہتی تھی۔ شہین نے رازدارانہ انداز میں مجھے یہ بھی بتایا کہ بڑے بیٹے وقار کو اس راہ پر ڈالنے والے اس کے اوباش دوست تھے جن کا سربراہ رئیس نام کا ایک بڑا ہوا مگر قلاش نواب زادہ تھا جو اپنے باپ کی تمام جائیداد تو طوائفوں اور کوٹھوں پر لٹائی چکا تھا مگر اب اس کی نظر وقار کی جاگیر اور حصے پر تھی۔ بڑے نواب صاحب یہ سب کچھ جاننے اور دیکھتے رہے تھے مگر خون کے گھونٹ پینے کے سوا اور کچھ کر نہیں سکتے تھے کیونکہ ان کی مرحومہ بیوی جاتے جاتے دونوں بیٹوں کو ان کے خلاف اور گستاخ کر گئی تھیں۔ شہین کچھ دیر مزید بھی میرے کمرے میں موجود رہنا چاہتا تھا مگر دھولی کے فیبر جیم نے ڈپٹ کر اسے میرے آرام کی خاطر کمرے سے باہر بھیج دیا اور مجھ سے معذرت کی کہ شہین کی قینچی کی طرح چلتی



زبان کو روکنے کا اس سے بہتر اور کوئی طریقہ نہیں تھا۔

میں نے ان دونوں کے جانے کے بعد کمرے کا جائزہ لیا۔ قالین، صوفوں اور پردوں کے رنگوں کی یکسانیت اور کمرے کے بھاری فرنیچر کی نفاست کا بیان طویل تھا۔ ایک طرف پڑھنے والا کو نہ بھی مخصوص تھا اور دیوار میں لگے شیف میں میرے مطلب کی بہت سی کتابیں ترتیب سی رکھی ہوئی تھیں۔ شاید نواب صاحب کو بھی اس بات کا اندازہ تھا کہ میں ان مضامین سے نااہل تھا اور میرے لیے ان کتابوں کو دہراتے رہنا بہت ضروری تھا۔ تاوقتیکہ میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو کر یہاں سے واپس چلا جاؤں۔ میں نے رات ڈھلنے کا انتظار کیا اور پھر نصف شب کے قریب اٹھ کر مردان خانے کا سرسری جائزہ لیا۔ اس طرح کہ مجھے اگر کوئی یوں آدھی رات کو بھٹکا ہوا دیکھ بھی لے تو اسے چہل قدمی سے زیادہ اہمیت نہ دے۔

مجھے کوئی غیر معمولی بات دکھائی نہیں دی۔ سوائے اس کے کہ نواز اور اس کا عملہ باہر فصیل پر اور مرکزی دروازے پر نہایت چاک و چوبند حاضر تھا اور ان کی موجودگی میں کوئی پردہ بھی اندر پر نہیں مار سکتا تھا۔ نواز نے مجھے بھی اپنے کمرے سے باہر نکلتے دیکھا تو وہ تیزی سے میری طرف آیا۔ ”خیر تو ہے آیا ن صاحب..... کسی چیز کی ضرورت تو نہیں.....“

”نہیں بس..... نیند نہیں آرہی..... شاید نئی جگہ کا اثر ہے.....“ نواز نے سر ہلایا ”ہو سکتا ہے..... مجھے بھی نئی جگہ پر ذرا مشکل سے ہی نیند آتی ہے“ نواز کا چہرہ حسب معمول ساٹ تھا جب سے میں یہاں آیا تھا میں نے اسے ایک بار بھی مسکراتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔

میں نے باہر گھاس کے میدان میں کچھ دیر چہل قدمی کی، اور کن اکھیوں سے آس پاس کا جائزہ لیتا رہا۔ زنان خانہ مردان خانے کے پیچھے ایک علیحدہ محل نما عمارت میں تھا اور مردان خانے سے کچھ راہداریوں کے ذریعے منسلک تھا۔ البتہ مردانہ اور زنانہ دونوں حصوں میں داخلے کے لیے الگ الگ راستے مخصوص تھے۔ میں نے چہل قدمی کے دوران حویلی کا محل وقوع خوب اچھی طرح ذہن نشین کر لیا۔ میرے ذہن میں سارنگا کی کہی ہوئی باتوں کی بازگشت ابھی تک موجود تھی جو اس نے یہاں بھیجے سے پہلے وقتاً فوقتاً مجھے بطور نصیحت اور سبق سکھائی تھیں۔ انہی میں سے ایک بات یہ بھی تھی کہ ”اجنبی منڈیوں پر چڑھنے سے پہلے ان کا نقشہ اچھی طرح ذہن میں بنالینا ضروری ہوتا ہے.....“

میں کچھ دیر چہل قدمی کے بعد اپنے کمرے میں واپس آ کر لیٹ گیا۔ مجھے اگلی صبح ایک اور امتحان سے گزرنا تھا اور نواب کی صاحبزادی سے اس کے اتالیق کے روپ میں ملنا تھا۔ اس کے لیے میرے ذہن کو باقی کسی قسم کی بھی سوچ یا فکر سے آزاد ہونا چاہئے تھا۔ ذہن کی گتھیاں کہیں اور الجھی ہوں تو کبھی کبھی ان جانے میں ہم اپنا آپ ظاہر کر جاتے ہیں اور میرے لیے اپنا بہرہ واپس قائم رکھنا بہت ضروری تھا۔

لیکن وہ ایک چہرہ مجھے یک سو رہنے ہی کب دیتا تھا۔ جیسے ہی میں نے پلکیں موندیں وہ میرے ذہن کے پردے پر کھلتا چلا گیا۔ وہی آسانی جو آ اور وہی کالی شمال..... آسمان پر گھٹائیں تو سب نے دیکھی ہیں لیکن گھٹاؤں پر آسمان شاید آج تک کسی نے نہ دیکھا ہو۔ میں ذمہ داری جلی آنے سے پہلے آخری مرتبہ شیخ صاحب کو ملنے کے لیے دو دن پہلے ہی سادات محلے کی دلیز تک گیا۔ دل کے اندر کے چور کا تو پتہ نہیں البتہ ذہن کا بہانہ یہی تھا کہ جانے سے پہلے انہیں خدا حافظ کہہ آؤں کہ جانے پھر کب ملاقات ہو، لیکن دروازے پر حید کا چہرہ دیکھ کر میں مایوس ہو گیا۔ خلاف معمول آج اس کے چہرے کی کرنشلی کچھ کم تھی۔ شیخ صاحب گھر پر نہیں تھے۔ میں واپس پلٹنے لگا تو حمید نے آواز دی ”اگر آپ کے پاس کچھ وقت ہو تو ہم اندر بیٹھ کر کچھ بات کر لیں“ میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا، لیکن اس کے چہرے پر سنجیدگی طاری تھی۔ کچھ دیر بعد ہم اسی بیٹھک میں بیٹھے ہوئے تھے جہاں

میں کئی بار پہلے بھی آپ کا تھا۔ حمید چائے کے برتن خود اندر سے اٹھا لایا اور جانے کیوں میرے کان ابھی تک ان مانوس آہٹوں اور قدموں کی چاپ کو محسوس کرنا چاہتے تھے جواب میرے لیے نامحرم ہو چکی تھی۔ حمید نے کچھ دیر برسی باتوں کے بعد اصل بات شروع کی۔ ”معاف کیجئے گا میں اس روز آپ کے ساتھ کافی تلخ بول گیا۔ دراصل دو جوان بہنوں کی ذمہ داری انسان کو تلخ بناتی دیتی ہے۔ اور پھر اس روز حالات ہی کچھ ایسے پیدا ہو گئے تھے کہ میں غصے کی رو میں بہہ گیا۔ دراصل میں جب گھر پہنچا تھا تو میں نے محلے کے چند اوباش لڑکوں کو ہماری گلی میں ادھر ادھر بے مقصد پھرتے اور ہمارے دروازے کی طرف جھانکتے دیکھا تھا۔ پہلی جھڑپ ان کے ساتھ ہوئی اور گھر پہنچا تو ستارہ گہنا بھی موجود نہیں تھیں اور پھر جب دروازے پر ان کو آپ کے ساتھ دیکھا تو جانے کیا کچھ کہہ گیا۔ بعد میں ستارہ نے جب مجھے ساری بات بتائی اور ابانے پہلے دن سے لے کر تب تک آپ کی طرف سے کی گئی مدد کے بارے میں بتایا تو مجھے اپنے رویے پر بڑی شرمندگی ہوئی۔“

میں نے اسے اس تکلف سے باز رکھنے کی کوشش کی اور ٹھیک اسی لمحے مجھے پردے کے پیچھے وہ مانوس سی خوشبو بھی محسوس ہوئی ”آپ خود کو نہ الجھائیں..... جو ہوا سو ہوا..... میرے دل میں کوئی ملال نہیں ہے.....“

”یہ آپ کا بڑا پین ہے۔ میری آپ سے ایک اور درخواست ہے..... اگر آپ برا نہ مانیں تو.....“

”جی..... فرمائیے.....“ حمید نے زبان سے ادا ہونے سے پہلے اپنی بات کو تولا ”میں نے اس علاقے میں آتے جاتے آپ کا نام سنا ہے۔ لوگ آپ کی بہت قدر کرتے ہیں لیکن افسوس یہ شہرت ایک اڈے کے ساتھ جڑی ہے۔ میرے گھر میں دو جوان بہنیں ہیں۔ مجھے آپ کے کردار کی سچائی کے لیے کسی بھی گواہی کی ضرورت نہیں کہ ابا کو انسان کی خوب پرکھ ہے۔ لیکن آپ کی اس اڈے سے وابستگی ہماری دلیز پر آنے والوں کے ذہن میں ہزار سوال پیدا کرتی ہے۔ لوگ اگر ہمارے سامنے نہیں تو ہماری پیٹھ پیچھے ایک دوسرے سے سوال ضرور کرتے ہوں گے کہ آخر ایک اڈے سے وابستہ بندہ یہاں کیوں آتا ہے۔ امید ہے آپ میری بات سمجھ گئے ہوں گے.....“ میرے ذہن میں بیک وقت کئی تیز آندھیاں اور طوفانی جھکڑ چل رہے تھے۔ وہ ٹھیک کہہ رہا تھا ایک بد معاش کا بھلا کسی شریف کے در پر کیا کام اور کیسی غرض.....؟؟

میں کھڑا ہو گیا ”آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں..... کسی بھی اڈے سے وابستہ بدنامی آپ کی دلیز تک نہیں آنی چاہئے۔ کاش یہ بات خود مجھے آپ سے پہلے سمجھ میں آ جاتی تو اچھا تھا۔ بہر حال آپ اس بارے میں ذرا بھی فکر مند نہ ہوں..... میں اب کبھی اس دروازے کی چوکھٹ پار نہیں کروں گا.....“ حمید نے کچھ کہنے کی کوشش کی لیکن شاید اب کچھ کہنے کے لیے باقی نہیں رہا تھا۔ میں شیخ صاحب کے گھر سے نکل آیا۔ میرا دماغ اس وقت بالکل سن تھا، لیکن حمید نے ایسا نیا کیا کہا تھا۔ اس کی بہن بھی تو مجھے کسی لوفریا آوارہ سے کم نہیں سمجھتی تھی۔ حمید نے تو بس کچھ دوسرے لفظوں میں وہ بات صرف دہرائی تھی۔

میرے دل میں اس بات کو یاد کر کے وحشت کی ایک ایسی شدید لہر اٹھی کہ میں نے گہرا کراکھیں کھول دیں۔ کمرے کا گھڑیاں صبح کے ساڑھے آٹھ بج رہا تھا مجھے یاد آیا کہ نواب صاحب نے ٹھیک نو بجے مجھے زنانہ خانے میں طلب کرنے کا وقت بتایا تھا۔ میں جلدی سے اٹھ بیٹھا۔ میرے پاس وقت بہت کم تھا۔



## باب 21

ٹھیک فوجے زنان خانے کی جانب سے شہن پیغام لے کر بڑا بڑا ہوا سا میرے کمرے میں داخل ہوا۔ اس کا لہجہ ہمیشہ کی طرح نستعلیق اور قافیہ درست تھا۔ ”آپ کو نواب صاحب زنانے میں یاد کرتے ہیں۔“ میں نے اسے چھیڑنے کی نیت سے دوبارہ پوچھا ”نواب صاحب کیا کرتے ہیں۔۔۔؟“ وہ مسکرا دیا ”اجی یاد کرتے ہیں آپ کو صاحب۔۔۔۔“ میں بھی ہنس دیا ”میرا نام آیاں ہے۔۔۔۔۔ مجھے صاحب نہ کہا کرو۔۔۔۔۔“ شہن کا چہرہ کھل گیا ”واقعی۔۔۔۔۔ آپ کا کشادہ ماتھا ہی آپ کے وسیع ظرف کی نشان دہی کرتا ہے۔۔۔۔۔ تو آیاں میاں کہہ لیا کروں۔۔۔۔۔؟“ ہم دونوں مختلف راہدار یوں سے گزرتے ہوئے زنان خانے کی طرف بڑھ رہے تھے۔ ”جو تمہارا جی چاہے کہہ سکتے ہو۔۔۔۔۔“ میری نظریں تیزی سے اس پاس کا جائزہ لے رہی تھیں لیکن مجھے کوئی غیر معمولی بات نظر نہیں آئی۔ شہن کی زبان پڑ پڑ چل رہی تھی۔ ”بس کیا بتائیں آیاں میاں۔۔۔۔۔ حویلی کی ساری ذمہ داری مجھی پر تو ڈال رکھی ہے نواب صاحب نے۔۔۔۔۔ سب ہی میری سنتے ہیں بس ذرا بڑی بہو ہیں ناں۔۔۔۔۔ نواب خاتون۔۔۔۔۔ ان کا مزاج ذرا کڑوا ہے۔۔۔۔۔ ان سے ذرا بچ کر رہیے گا۔۔۔۔۔“ وہ شاید نواب کے مرحوم بڑے بھائی کی بیوہ کی بات کر رہا تھا۔ پاشا صاحب کی دی ہوئی اطلاع کے مطابق حویلی کا کھلی نظام در پردہ نواب خاتون ہی دیکھتی تھیں اور انتہائی سخت مزاج خاتون مشہور تھیں۔ ان کے کیے گئے فیصلوں میں نواب و پیر بھی دخل نہیں دیتے تھے۔ آخری راہداری سے نکلنے ہی ہم ایک کشادہ پائیں باغ نما لان میں نکل آئے۔ سامنے ہی زنان خانے کی سفید اور سبز سنگ مرمر سے بنی پر شکوہ عمارت غرور سے سر تانے کھڑی تھی۔ نواب صاحب اور ایک نازک سی خاتون باہر دالان میں کچھی چھتریوں کے سائے تلے بیٹھے ہوئے تھے۔ نواب صاحب نے میرا استقبال کیا اور شہن کو ہاتھ کے اشارے سے جانے کا کہا ”آؤ آیاں میاں آؤ۔۔۔۔۔ ان سے ملو۔۔۔۔۔ یہ ہماری بیگم خانم جان ہیں“ میں نے اس طرح سے چہرے والی عورت کو سلام کیا۔ انہوں نے مسکرا کر سر ہلایا۔ خانم جان نے اپنے سر پر مخصوص ایرانی سکارف کو حجاب کی طرح باندھ رکھا تھا اور صبح کی خنک ہوا سے بچنے کے لیے انہوں نے نیلے رنگ کا ایک لمبا سا کوٹ پہن رکھا تھا۔ ان کی آواز بڑی شستہ تھی۔ ”تو تم ہو ہماری فضا کے اتالیق، بھیجی ہم تو کسی کمرہ جھکائے اور نظر پر موٹا چشمہ لگائے بزرگ کا انتظار کر رہے تھے۔ تم تو ابھی خود طالب علم لگتے ہو۔۔۔۔۔“

”جی۔۔۔۔۔ بس طالب علم ہی سمجھیں۔۔۔۔۔ علم کا سلسلہ تو کہیں رکتا نہیں۔“ وہ مسکرائیں ”درست۔۔۔۔۔ درست۔۔۔۔۔ ماشا اللہ۔۔۔۔۔“ نواب نے خانم سے پوچھا ”بھیجی آپ کی صاحب زادی نہیں آئیں ابھی تک۔۔۔۔۔“ ان کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی اندر سے فیلر، کوٹ اور سر پر وہی مخصوص ایرانی حجاب نما سکارف باندھے ایک نوجوان لڑکی نمودار ہوئی۔ میں احتراماً کھڑا ہو گیا۔ ”یہ بوبھی۔۔۔۔۔ آگئیں فضا۔۔۔۔۔“ فضا خانم کی ہی کوئی نوجوانی کی تصویر معلوم ہو رہی تھی۔ خانم نے اسے ہلکے سے تھپہا پوچھا ”اس کزدیر۔۔۔۔۔؟“ (اتنی دیر)۔۔۔۔۔ فضا نے جلدی سے تلافی کی ”معذرت۔۔۔۔۔ موغش (معافی چاہتی ہوں)۔“ نواب نے اس سے میرا تعارف کروایا ”بیٹی یہ آیاں احمد صاحب ہیں۔۔۔۔۔ آپ کے اتالیق۔۔۔۔۔“ فضا نے جلدی سے مجھے سلام کیا ”خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔۔۔۔۔ کب سے میں آغا جان سے درخواست کر رہی تھی کہ میرے لیے کسی میوٹر کا انتظام کر دیں۔۔۔۔۔ لیکن اس



ویرانے میں آنے کے لیے کوئی تیار ہی نہیں ہوتا تھا..... آپ کا بہت بہت شکریہ جناب..... تشکر.....“

دونوں ماں بیٹی کی زبان سے ک اورق کا فرق بہت بھلا محسوس ہوتا تھا۔ میں نے مسکرا کر اس عفت مآب کے تشکر کا جواب دیا۔ فضلہ کی پکلیں اپنی ماں کی طرح گھٹی اور سیاہ تھیں۔ ایران کا حسن پہلی نظر میں خیرہ نہیں کرتا، مگر اس کے جوہر دھیرے دھیرے کھلتے ہیں اور پھر وہ سنہری عارض اور وہ سرمئی آنکھیں اپنا سکھایا جاتی ہیں کہ بڑے بڑے شہنشاہ اس کوئے یار میں جھک کر حاضری دیتے ہیں.....

میری فضلہ سے صبح کی یہ ملاقات مختصر رہی اور طے پایا کہ روزانہ شام 4 بجے ایک گھنٹہ کے لیے کہیں زنان خانے میں ڈرائنگ روم یا لان وغیرہ میں درس و تدریس کا سلسلہ جاری رکھیں گے۔ میں نے واپسی کے لیے رخصت طلب کی تو نواب صاحب کو کچھ یاد آیا ”ارے آیان میاں..... مردان خانے کی بالائی منزل پر حویلی کی لائبریری بھی موجود ہے۔ وہاں دنیا بھر کی کتابیں اکٹھی کر رکھی ہیں مرحوم بڑے نواب صاحب نے..... تم چاہو تو وہاں سے بھی اپنے مطلب کے حوالے جمع کر سکتے ہو۔“ اتنے میں ایک بوڑھی نوکرانی نے آکر اطلاع دی کہ اگر نواب صاحب ملاقات سے فارغ ہو چکے ہوں تو نواب خاتون ان سے کچھ ضروری بات کرنا چاہتی ہیں۔ نواب نے فوراً اثبات میں سر ہلایا ”ہاں ہاں کیوں نہیں..... بلکہ وہ یہیں کیوں نہیں آ جاتیں..... خانم اور فضلہ بھی یہیں ہیں“ میں نے مزید وہاں رکنا مناسب نہیں سمجھا اور اجازت کے لیے نواب صاحب کی طرف دیکھا۔ نواب صاحب نے اسی خادمہ کو مجھے مردان خانے تک چھوڑ کر آنے کا حکم دے دیا۔ واپس پلٹتے وقت میں نے روایتی غرارے کے لباس میں ایک پکی عمر کی عورت کو آتے دیکھا جس کے چہرے سے نخوت اور بے زاری ٹپک رہی تھی۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے قریب سے گزرے تو اس نے سر سے پیر تک مجھے غور سے دیکھا اور حکمانہ لہجے میں بولیں ”کو.....“ میں ٹھہر گیا ”تو تم ہی ہو فضلہ کے نئے استاد؟..... لیکن چہرے سے تو استاد نہیں لگتے.....“ میرا جی چاہا کہ انہیں جواب دوں کہ آپ بجا فرماتی ہیں..... میں استاد ہوں..... لیکن رنگا بھائی کے اڈے کا“ کچھ دیر تک وہ میرا نقدانہ جائزہ لیتی رہیں اور پھر انہوں نے مجھے جانے کی اجازت دے دی ”چھا ٹھیک ہے جاؤ..... لیکن زنان خانے کے آداب کا خیال رہے۔“ اب میں انہیں کیا بتاتا کہ مجھے تو ابھی تک مردان خانے کے آداب کا بھی نہیں پتہ لیکن میں بنا کچھ کہے سلام کر کے آگے بڑھ گیا۔

شام تک میرے پاس کافی وقت تھا اور میں نے یہ وقت کمرے میں بندرہ کر صرف کرنے کے بجائے زمر حویلی کے آس پاس مضافات کا جائزہ لینے میں گزارنے کا فیصلہ کیا۔ حویلی کے آس پاس گندم کے کھیت اور دور تک پھیلی خاموشی تھی۔ جانے کیوں مجھے اس لمحے بہت دن پہلے کا کہیں پڑھا جون ایلیا کا شعر یاد آ گیا۔

قابل رحم ہیں وہ دیوانے

جن کو حاصل نہیں ہیں ویرانے

میں نے ایک بات خاص طور پر محسوس کی کہ نواز اس تمام عرصے میں مجھ پر خصوصی نظر رکھے رہا، لیکن مجھے اس کی مستعدی سے زیادہ اس کمزور کڑی کی تلاش تھی جہاں سے نواب صاحب پر اگلا حملہ ممکن ہو سکتا تھا۔ کمرے میں واپس آ کر میں نے حویلی میں اب تک میری جن لوگوں سے ملاقات ہوئی تھی ان سب کی ایک فہرست بنائی اور موسوی کی ہدایت کے مطابق ان سب کو شک کے دائرے میں ایک ایک کر کے رکھا اور پھر ایک نئی

فہرست بنائی جس میں نمبر شمار میرے زیادہ شک کی بنیاد سے ہو کر نیچے تک جاتے تھے۔ اس فہرست میں سب سے اوپر نواب تھا۔ پھر نواب صاحب کے دونوں بیٹے، ان کے ذاتی محافظ اور اسی طرح میں اپنی پہلی کیفیت کے حساب سے سب ہی کو شک کی نظر سے دیکھتا، سوچتا اور پھر رد کرتا گیا لیکن کسی بھی نتیجے پر نہ پہنچ سکا۔

چار بجے کے قریب ایک بار پھر شہن مجھے لینے کے لیے آگیا۔ وہ منہ ہی منہ میں نہ جانے کیا بڑبڑا رہا تھا۔ میں نے اس کے بگڑے موڈ کی وجہ پوچھی تو وہ پھٹ پڑا۔ ”بس کیا بتائیں آیان میاں..... ان دونوں بھائیوں کی آپسی چچقلش نے ہم نوکروں کا جینا حرام کر رکھا ہے۔ ایک کی بات مانو تو دوسرا بگڑ جاتا ہے، ایک کوئی حکم دیتا ہے تو دوسرا اس کی ضد میں اس سے بھی بڑی فرمائش کر بیٹھتا ہے اور قہر نہ ہونے پر ڈانٹ ہم غریبوں کو پڑتی ہے۔“

”لیکن یہ دونوں تو گئے بھائی ہیں ناں..... پھر ان میں آپس میں اتنی دشمنی کی وجہ کیا ہے۔“ شہن کی آواز دھیمی ہوئی ”اب ہم کچھ بولیں گے تو راز افشائی کا طعنہ سنیں گے۔ سنا ہے دونوں نواب خاتون کی کسی بھانجی پر فدا ہیں..... سہلی نام ہے بچی کا..... لیکن نواب خاتون دونوں کو ہی ہاں کہتیں ہیں نہ ناں..... سچ کہوں تو مجھے اس دشمنی کا خاتمہ صرف نواب خاتون کے ہاتھوں لکھا نظر آتا ہے۔ کیونکہ دونوں ہی بھائی ان کی بہت سنتے ہیں.....“

شہن جاتے جاتے مجھے ایک نیازاویہ بھی دکھا گیا تھا۔ میں زمان خانے کے والا ان تک پہنچا تو فضلہ مجھے وہیں حویلی میں بہتی ایک چھوٹی سی پانی کی مصنوعی نہر کے کنارے ڈالی ہوئی کرسی پر بیٹھی نظر آگئی۔

”میں آپ ہی کا انتظار کر رہی تھی۔“ وہ حسب معمول سر پر اپنے جیر بن سے میل کھاتا سا کرف باندھے ہوئے تھی اور نہر کے پانی میں پڑتی ہوئی کرنوں کا عکس اس کے چہرے کو جھللا رہا تھا۔ میں بھی اس کے قریب پڑی دوسری ٹاٹ کی کرسی پر بیٹھ گیا اور میں نے اندازہ لگانے کے لیے اس سے کہا کہ وہ اس علاقے کی تاریخ اور تہذیب کے بارے میں جو کچھ خود جانتی ہے، پہلے مجھے وہ بتائے۔ اس سوال کا مقصد خود اپنے آپ کو جانچنا بھی تھا کہ میں کتنے دن تک فضلہ کو اپنے محدود علم کی بنیاد پر پڑھا سکتا تھا، لیکن فضلہ کی ان دونوں مضامین میں پہنچ دیکھ کر مجھے اسی دن اندازہ ہو گیا کہ یہ تیل زیادہ عرصے تک منڈیر نہیں چڑھ پائے گی۔

”آپ کو تو یہاں کی تاریخ کی اچھی خاصی سوجھ بوجھ ہے اور علاقے کی قدیم اور جدید تہذیب کے موضوع پر بھی آپ کی گرفت مضبوط ہے..... تو پھر یہ خصوصی طور پر کسی استاد کو رکھنے کی وجہ سمجھ نہیں آتی۔“

فضلہ ہنس پڑی ”سچ بتاؤں تو میں بھی کوئی بزرگ نما اتالیق ہی تصور کیے بیٹھی تھی۔ سوچا تھا کہ ان سے خوب لمبی لمبی بحث کر کے اپنی قابلیت کا رعب بھی جماؤں گی اور ان کے تجربے سے اپنے اندر کے سوالات کی پیاس بھی بجھاؤں گی۔ مجھے اردو بھی ایسے ہی ایک بزرگ استاد کی وساطت سے سیکھنے کا شرف حاصل ہوا تھا مگر آپ کو دیکھ کر میں اور مومو دونوں ہی بہت حیران ہیں۔ برانہ مایے گا لیکن آپ بھی میری طرح ابھی تازہ گرجوٹ ہی لگتے ہیں، لیکن اگر آغا جان نے آپ کا انتخاب کیا ہے تو ضرور کچھ سوچ کر ہی کیا ہوگا۔ مجھ سے کوئی گستاخی ہوئی ہو تو معاف کر دیجئے گا.....“

میراجی چاہا کہ میں اس معصوم لڑکی کو سچ بتا دوں لیکن بڑی مشکل سے میں نے خود کو باز رکھا۔ اتنے میں خانم بھی اندر سے نکل کر بیس والاں میں بیٹھا دیکھ کر ہماری جانب چلی آئیں ”تم دونوں یہاں بیٹھے ہو..... میں چائے کا پوچھنے آئی تھی کہ اندر لگواؤں یا سہیں بھیج دوں.....“ فضلہ

نے ماں کو روک لیا۔ ”آپ بیٹھیں مومو جان۔۔۔۔۔ چائے پیئیں آجائے گی۔ میں نے کہہ رکھا ہے۔“

خانم نے مسکراتے ہوئے میری جانب دیکھا۔ ”ہاں تو کیا بات ہو رہی تھی شاگرد اور اتالیق کے درمیان۔۔۔۔۔“ میرے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔ ”یہ کہ انہیں پہلے ہی مضامین کے بارے میں اتنا زیادہ علم ہے کہ کچھ دنوں میں یہ میری اتالیق بن جائیں گی۔“ دونوں ماں بیٹی زور سے ہنس پڑیں۔ خانم نے مجھ سے کہا ”تمہاری ایک بات مجھے بہت پسند آئی۔۔۔۔۔ تم نے آتے ہی اپنی قابلیت کا رعب ڈالنے کی کوشش نہیں کی کسی پر۔۔۔۔۔ علم انسان کو سمندر کی طرح گہرا بنا دیتا ہے۔۔۔۔۔ اسے بار بار چھلکنے سے روکتا ہے۔“

میں نے صاف دلی سے کہا ”میں سمجھتا ہوں آپ کی صاحب زادی کو مجھ سے کہیں زیادہ تجربہ کار استاد کی ضرورت ہے جو صرف اب ان کے اندر بہتے علم کے دریا کو کوزے میں بند کر سکے۔۔۔۔۔ میری یہاں موجودگی صرف ان کے وقت کا ضیاع ہی نہ ثابت ہو۔۔۔۔۔“ فضا جلدی سے بول پڑی ”ارے نہیں نہیں۔۔۔۔۔ ایسا کیوں کہا آپ نے۔۔۔۔۔ میرا مومو کا مقصد ہرگز یہ نہیں تھا۔ ہر انسان دوسرے انسان کو کچھ نہ کچھ دے کر ہی جاتا ہے۔۔۔۔۔ اب یہ ہم پر منحصر ہے کہ ہم اس سے کیا فیض حاصل کرتے ہیں۔ آپ سے میری یہ گزارش ہے کہ آپ مجھ سے ایک ایسے دوست کی مانند رہ سب علم بانٹیں جو آپ کے پاس ہے۔۔۔۔۔ چاہے وہ کتابی نہ بھی ہو۔۔۔۔۔ کتاب ہی مقصد ہوتا تو وہ میں خود بھی پڑھ سکتی تھی۔ آپ مجھ سے اپنی وہ سوچ بانٹیں جو ان کتابوں میں لکھی تعلیم نے آپ کے اندر پیدا کی ہے۔ بدلے میں میں بھی یہی کچھ تقسیم کرنے کی کوشش کروں گی۔“

فضا کی بات سن کر میرے سر سے ایک بہت بڑا بوجھ اتر گیا۔۔۔۔۔ سچ تو یہی تھا کہ کتابی علم کی صورت میں اسے دینے کے لیے میرے پاس کچھ بھی نہیں تھا ہاں۔۔۔۔۔ میں کیا سوچتا تھا اگر اس سے ہم دونوں کی اس علم کی تحریک کو کوئی فائدہ ملتا تھا تو یہ ہم دونوں کے لیے ہی منافع بخش سودا تھا کیونکہ بدلے میں مجھے بھی تو اس کی سوچ جاننے کا موقع مل رہا تھا۔ جانے ہمارے تعلیمی اداروں میں کتابیں ذہن میں ٹھونسنے پر ہی کیوں زور دیا جاتا تھا۔ کتاب کے ذریعے سوچ کو پروان چڑھانے کے عمل کو فروغ کیوں نہیں دیا گیا آج تک؟؟؟

پہلے دن کا اختتام بہتر طریقے سے ہونے پر میں نے دل ہی دل میں اللہ کا شکر ادا کیا، لیکن مردان میں داخل ہوتے ہی تیز تیز بولنے اور جھگڑنے کی آوازیں نے میرے قدم روک لیے۔ وقار اور سجاد میں تیز بحث جاری تھی اور نواب صاحب سر جھکائے دونوں کے درمیان پریشان بیٹھے ہوئے تھے۔ وقار نے چلا کر کہا ”بس بہت ہو گیا۔۔۔۔۔ آپ کے پاس اس کی شکاری فضول خرچیوں کے لیے تو رقم کی کوئی کمی نہیں۔۔۔۔۔ اور میں اگر کبھی اپنے دوستوں کی دعوت کے لیے کچھ روپے اضافی مانگ لوں تو آپ کو اپنے اصول یاد آ جاتے ہیں۔“ سجاد نے ترکی بہ ترکی بلند آواز سے کہا ”میں شکار پر خرچ کرتا ہوں کوٹھوں پر نہیں۔۔۔۔۔ میری برابری کرنے کی کوشش نہ ہی کریں تو بہتر ہے۔“ بڑے بھائی سے یہ جملہ برداشت نہیں ہوا اور وہ تیزی سے چھوٹے کی جانب بڑھا ”بہت زبان چلنے لگی ہے تمہاری۔۔۔۔۔ آج اس کا بھی بندوبست کیے دیتا ہوں۔“ نواب صاحب کی برداشت جواب دے گئی اور وہ زور سے چلا کر اٹھ کھڑے ہوئے ”شرم آئی چاہئے تم دونوں کو۔۔۔۔۔ اب تو باپ کی موجودگی کا لحاظ نہیں رہا کسی کو۔ میں نے بہت برداشت کر لیا۔ اب اگر تم دونوں نے اس بات کو بڑھایا تو دونوں کو ہی عاق کر دوں گا۔“ وقار نے باپ کی جانب دیکھا ”میں جانتا ہوں کہ آپ ایسے ہی کسی موقع کی تاک میں ہیں تاکہ میرے حصے کی وراثت بھی اپنی اس لاڈلی بیٹی کو منتقل کر سکیں۔“ وقار پیر پختا ہوا وہاں سے چلا گیا۔ میں ایک اوٹ



# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

## یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

### ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بُک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✧ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریچ
- ✧ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے شرٹک نہیں کیا جاتا
- ✧ ہر ای بُک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو مائیل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بُک کا پرنٹ پریویو
- ✧ ہر پوسٹ کے ساتھ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریچ
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

**We Are Anti Waiting WebSite**

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

# WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on  
Facebook

[fb.com/paksociety](https://fb.com/paksociety)



[twitter.com/paksociety1](https://twitter.com/paksociety1)



میں کھڑا تھا لہذا اس کی نظر مجھ پر نہیں پڑی۔ چھوٹا سجاد بھی بکتا جھکتا وہاں سے چلا گیا جاتے جاتے اس نے باپ سے اپنے حصے کی جائیداد کی علیحدگی کا مطالبہ بھی کیا۔ ان دونوں کے جانے کے بعد میں مرکزی ہال میں ہوتے اس تماشے کے آخری کردار نواب دبیر کے سامنے آ گیا۔ وہ ابھی تک اپنا سر تھامے بیٹھے ہوئے تھے۔

”آؤ آیان میاں..... تم نے اس ناخلف اولاد کی زبان درازی تو دیکھ لی ہوگی۔ جانے میری تربیت میں ہی کچھ کی تھی یا پھر کہیں اور چوک ہو گئی ہے مجھ سے..... یہ دونوں پہلے تو ایسے کبھی نہ تھے.....“ میں نے ایک تلخ سوال کیا ”کیا آپ سمجھتے ہیں کہ ان دونوں میں سے بھی کوئی آپ کی جان کے درپے ہو سکتا ہے، تاکہ آپ کی وراثت اسے جلدی منتقل ہو سکے.....“ نواب صاحب بری طرح چونک گئے۔ خون کے رشتے بعض اوقات انسان کی آنکھوں پر گہرے کالے پردے ڈالے رکھتے ہیں۔ ”نہیں نہیں..... یہ دونوں کتنے بھی نافرمان کیوں نہ سہی..... مگر اپنے باپ کی جان نہیں لے سکتے..... مجھے یقین نہیں آتا.....“

میں نے نواب صاحب کو زیادہ کریدنا مناسب نہیں سمجھا۔ نہ ہی میں نے ضمن سے سنی بات ان کے کان میں انڈیلی کہ اس اچانک تبدیلی کی وجہ کہیں ان کی اپنی بھابھی نواب خاتون تو نہیں کیونکہ کسی بھی حتمی فیصلے پر پہنچنے سے پہلے مجھے ابھی بہت سے کام انجام کو پہنچانے تھے۔ بہت سے چہروں کو ٹٹولنا تھا۔



## گزبڑ گھوٹالہ

**گزبڑ گھوٹالہ** ڈاکٹر مظہر عباس رضوی کی مزاحیہ شاعری کا مجموعہ کلام ہے۔ یہ انکی مزاحیہ شاعری کی تیسری کتاب ہے۔ اس سے پہلے ان کی شاعری کی دو کتابیں ”ہوئے ڈاکٹری میں رسوا“ اور ”دوا بیچتے ہیں“ شائع ہو چکی ہیں۔ ڈاکٹر مظہر عباس رضوی کی یہ شاعری اس اعتبار سے منفرد ہے کہ انہوں نے اپنی شاعری میں ڈاکٹری، ہسپتال اور بیمار یوں جیسے خشک موضوعات کو مزاح کے لطیف قالب میں ڈھالا ہے۔ ان کی نظموں اور غزلوں کے چند عنوانات ہیں ”یرقان آرزو، سو ہے وہ بھی ڈاکٹر، درد عرق النساء، پیوند کاری، زس، ای سی جی، لفظی پوش مارٹم، بکڑے جگر کے“ وغیرہ وغیرہ۔

**گزبڑ گھوٹالہ** کتاب گھر پر دستیاب۔ جسے شاعری کے طنز و مزاح سیکشن میں دیکھا جاسکتا ہے۔

## باب 22

وہ رات میں نے اپنے کمرے میں ہی گزاری۔ دونوں بھائی ناراض ہو کر شام ہی سے گھر سے باہر جا چکے تھے اور صبح تک ان کی واپسی کی کوئی امید نہیں تھی۔ پاشا صاحب اپنے کسی قریبی رشتے دار کے ہاں کسی تقریب میں گئے ہوئے تھے اور ان کی واپسی اب اگلے ہفتے ہی متوقع تھی۔ گویا مردان خانے میں اس رات میرے اور حویلی کے ملازموں کے علاوہ دوسرا کوئی نہیں تھا۔ میرا بار بار باہر ٹھلانا نواز کو مشکوک کر سکتا تھا لہذا میں نے خود کو کمرے تک ہی محدود رکھا۔ جانے کیوں آج مجھے راجہ بالا اور مشی تینوں ہی بہت یاد آ رہے تھے۔ جانے وہ کیسے ہوں گے..... مجھے یاد تو ضرور کرتے ہوں گے۔ کیفے فراق میں ان کی محفلیں اب بھی اسی طرح جتنی ہوں گی یا نہیں..... چچا فراق کیسے ہوں گے..... مرزا اب بھی ان تینوں کے لیے فراق بچا سے چھپا کر فریش رول اور گرم پیٹیز رکھتا ہوگا یا نہیں؟..... سب کچھ ویسا ہی ہوگا..... بس میری کمی ہوگی.....

میں جانے کن خیالوں میں کھویا ہوا تھا۔ اچانک مجھے باہر کسی کھٹکے کی آواز سنائی دی۔ میں چونک کر اٹھ بیٹھا اور پھر دوسرے کھٹکے سے پہلے ہی میں آہستگی سے اپنے کمرے سے نکل چکا تھا۔ آواز اوپر والی منزل سے آئی تھی میں دبے پاؤں مگر تیزی سے سیڑھیاں چڑھ کر اوپر راہداری میں آ گیا۔ راہداری سنسان پڑی ہوئی تھی۔ اسی منزل پر حویلی کی لائبریری بھی تھی۔ میں نے چاروں طرف گھوم کر اچھی طرح جائزہ لیا مگر وہاں کوئی نہیں تھا۔ میں کچھ دیر انتظار کے بعد واپس اپنے کمرے میں آ گیا۔ اگلی صبح میں نے نواب صاحب سے بریکفیل تذکرہ پوچھا کہ مردان خانے کی دوسری منزل پر عام حالات میں کون رہا کس پذیر ہوتا ہے۔ انہوں نے بتایا کہ کوئی مستقل رہائشی نہیں ہے دوسری منزل کا بس کبھی کبھار چوکیدار یا محافظ رات کو وہاں کا چکر لگا لیتے ہیں، لیکن جانے کیوں مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ وہ کسی محافظ کی آہٹ نہیں تھی۔ میں نے بات ٹال دی۔

شام کو فضا اپنی کل والی جگہ پر ہی میرا انتظار کر رہی تھی لیکن آج وہ کتابیں لے کر نہیں آئی تھی۔ البتہ اس کے ہاتھ میں ایک نوٹ بک ضرور موجود تھی۔ جس میں اس نے اس علاقے کی طرز تعمیر کے بارے میں اپنے کچھ مشاہدات درج کیے ہوئے تھے ”آپ کیا سمجھتے ہیں..... مغل اس خطے کے آرکیٹیکچر Architecture پر اتنا اثر انداز کیوں ہو پائے.....؟“

”شاید اس لیے کہ وہ اپنے ساتھ ایک نئی تازگی اور تعمیرات میں کسی خوبصورت تصویر جیسی باریکیاں لے کر آئے تھے۔ اب آپ اپنے اس محل کو ہی لے لیں۔ یہ بذات خود اس وادی میں اور ان کھیتوں کے درمیان کسی ایک خوبصورت پینٹنگ کی طرح ہی تو لگتی ہے..... مغل واقعی مصور تھے.....“ فضا مسکرائی ”آپ مغلوں سے بہت متاثر لگتے ہیں.....“

”نہیں..... خود اپنے آپ سے کیا متاثر ہوتا..... ہم بھی مغل ہیں.....“ فضا خوشی سے بے یقینی سے چلائی ”اچھا..... واقعی..... اوہ یہ کتنی حیرت کی بات ہے اور میں آپ کو بتاؤں کہ میں واقعی مغلوں سے بہت متاثر ہوں..... آپ سے مل کر خوشی ہوئی سر آیان مغل.....“ ہم دونوں ہنس پڑے۔ اس دن ہم دونوں نے بہت دیر تک مغل تہذیب اور طرز تعمیر پر اپنے اپنے خیالات بانٹے اور اپنا اپنا نظریہ پیش کیا۔ فضا ایک ذہین لڑکی تھی اور



اس کی سوچ کے زاویے بہت منفرد تھے۔ وہ شاید زمر دھوہیلی میں تنہائی کا بھی شکار تھی کیونکہ ماں کے علاوہ کسی اور کے پاس یہاں اس کے لیے وقت نہیں تھا۔ میں جان بوجھ کر کم بولتا اور اسے زیادہ سنتا رہا۔۔۔۔۔ اور وہ تھی بھی کچھ ایسی ہی قابلِ سماعت۔۔۔۔۔ خود میرے بھی بہت سے مبہم زاویے اس کی معلومات سے واضح ہوتے گئے اور پھر ہمارا یہ روز کا معمول بنتا چلا گیا۔ ہم روزانہ زمر دھوہیلی کی اس نہر کے کنارے بیٹھ کر خود اپنے اندر کو کھوجتے اور فضا ہم باتیں نوٹ بک میں درج کرتی رہتی۔ اب میں اس کا استاذ نہیں تھا بلکہ ہم دونوں ہی اپنی اپنی سوچ اور خیال سے ایک دوسرے کو تعلیم دے رہے تھے۔ دھیرے دھیرے خود مجھے بھی ان مضامین سے دلچسپی محسوس ہونے لگی تھی اور میں نے خود اپنی معلومات کے لیے اپنی لائی ہوئی اور لاہریری میں موجود کتابیں کھگانا شروع کر دی تھیں۔ اب جب میں فضا سے یہاں کی تاریخ اور تہذیب پر بات کرتا تھا تو وہ ماضی کی طرح میرے رٹے رٹائے جیسے نہیں ہوتے تھے بلکہ میری اپنی کھوج اور تحقیق ہوتی تھی۔ فضا کی صحبت آیان احمد کو بھی کتابوں سے محبت کرنا سکھاری تھی یا شاید میں اندر سے تبدیل ہو رہا تھا لیکن جس اصل مقصد سے میں زمر دھوہیلی میں داخل ہوا تھا وہ ابھی تک میری نظروں سے اوجھل تھا۔ پاشا صاحب بھی واپس آ چکے تھے اور دن گزرتے جا رہے تھے۔ مجھے فضا جیسی سچی اور صاف گولڑکی سے اپنی حقیقت چھپانا بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا لیکن عجیب الجھن تھی کہ میری شناخت کا پھپھار ہنا خود اسی کے گھرانے کے لیے ضروری تھا۔

آخر کار مجھے زمر دھوہیلی میں داخل ہوئے دو ہفتے سے زیادہ ہو گئے میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اب ہمیں حملہ آور کا چھپ کر انتظار کرنے کے بجائے اسے خود آگے بڑھ کر حملہ کرنے کی ترغیب اور لالچ دینا ہوگی۔ میں نے نواب صاحب کو اپنے منصوبے سے آگاہ کیا تو پاشا صاحب فکر مند ہو گئے۔ ”لیکن میاں یہ بھی تو سوچو کہ اگر ہم سے ذرا سی بھی چوک ہوگئی تو نواب صاحب کی جان کو واقعی خطرہ ہو سکتا ہے۔“ میں نے ان پر واضح کیا کہ ہم اعلان کی حد تک یہ مشہور کریں گے کہ نواب صاحب اپنی بیگم خانم سے کسی کھٹ پٹ کی وجہ سے مردانے کی خواب گاہ میں منتقل ہو رہے ہیں جبکہ اصل میں وہ اپنی مردانے والی خواب گاہ میں نہیں میرے کمرے میں سوئیں گے اور ان کی خواب گاہ میں ان کے بستر پر میں موجود رہوں گا۔ نواب صاحب نے بھی میری حفاظت کے پیش نظر کچھ تامل کیا لیکن میں نے آخر کار انہیں قائل کر ہی لیا کہ شکار کو اس کی کمین گاہ سے نکالنے کے لیے یہ چارہ ڈالنا بہت ضروری ہے۔ طے یہ پایا کہ نواب صاحب ایک آدھ دن میں میرے منصوبے کے مطابق مردانے میں منتقل ہو جائیں گے اور خانم کو اس معاملے میں اعتماد میں لینے کی ضرورت پڑی تو اس سے بھی دریغ نہیں کیا جائے گا۔

اس رات میں اپنے منصوبے کی جزئیات پر غور کرنے کے لیے بہت دیر تک جاگتا رہا۔ ویسے بھی نیند کا اور میرا ساتھ تو جانے کب کا چھوٹ چکا تھا کبھی یہ نیند میری کتنی گہری سہیلی ہوتی تھی۔ مجھے اپنے گھر کی نیند یاد آتی۔ امی، ریحان اور چھوٹی دن چڑھے تک مجھے جگا جگا کر تھک جاتی تھیں اور پھر آخر کار بابا کے حکم پر ریحان باقاعدہ بالٹی بھر پانی لا کر مجھ پر انڈیل دیا کرتا تھا۔ کاش ہمارے من میں نیند اور بے داری کا بھی کوئی مخصوص خود کار نظام ہوتا تو کم از کم اپنی آدمی زندگی تو اپنی مرضی سے بتا سکتے۔۔۔۔۔ میری نیندیں تو اس حسن بے پرواہ نے برباد کر دی تھیں جسے آخری لمحے یہ احساس بھی نہیں ہو۔ کا کہ کوئی اس کے لیے دھیرے دھیرے اندر سے مر رہا ہے۔ گہنا کا خیال آتے ہی میرے آس پاس پھر سے اسی اداسی کی گہری دھند اور کبرا اچھا گیا جو میرے آس پاس باقی تمام مناظر دھندلا دیتا تھا۔

اچانک مجھے اوپر کی منزل سے پھر وہی ہلکے قدموں کی چاپ اور کسی تالے کے کھلنے جیسا کھٹکنا سنائی دیا۔ اس بار مجھے اپنی سہمتوں پر بالکل شک نہیں ہوا۔ میں بجلی کی تیزی سے اپنے کمرے سے نکلا اور اوپر کی منزل کی جانب لپکا۔ اوپر راہداری مکمل اندھیری اور سنسان تھی۔ اچانک ایک ستون کے پیچھے نیچے دالان سے آتی روشنی کے ایک ٹکڑے میں مجھے کسی ہولے کا سایہ سا دکھائی دیا۔ کوئی شخص اپنے آپ کو بڑی سی کالی چادر میں لپیٹے میری موجودگی سے بے خبر دوسری منزل پر بنے کسی کمرے میں داخل ہو گیا۔ میرے پاس فیصلہ کرنے کے لیے بہت کم وقت تھا۔ دوسرے ہی لمحے میں اس دروازے کے باہر دیوار سے ٹیک لگا کر اپنا سانس روکے کھڑا تھا۔ اس کمرے کا ایک ہی دروازہ کھلا تھا اور دوسرے بڑے دروازے کے باہر لگا ہوا سا تالہ مجھے یہاں سے بھی بند نظر آ رہا تھا۔ لمحے برسوں کی طرح گزرنے لگے۔ جانے وہ اتنی دیر تک اندر کیا کر رہا تھا۔ قریباً بیس منٹ بیس صدیوں کی طرح بتانے کے بعد میں نے آخر کار خود اندر جانے کا فیصلہ کر لیا لیکن ٹھیک اسی وقت اندر سے کسی کے دھیمے قدموں کی چاپ نے مجھے پھر سے دم سادھنے پر مجبور کر دیا۔

کوئی دھیرے دھیرے چلتا ہوا دروازے تک آیا اور پھر اس نے باہر قدم رکھا ہی تھا کہ میرے ہاتھ کے نیچے کی مضبوط گرفت نے اس اجنبی کی کلائی کو جکڑ لیا مجھے موسیٰ کا دیا ہوا ابتدائی سبق یاد آیا۔ دشمن کے ہاتھ کو سب سے پہلے قابو کر لو تو وہ آدھا رہ جاتا ہے کیونکہ سب سے پہلی جدوجہد اور کوشش ہاتھ کی ہی ہوتی ہے۔ مخالف کا ہاتھ ناکارہ کر دو تو آدمی جیت پہلے ہی اپنے نام ہو جاتی ہے۔

لیکن اس سے پہلے کہ میں اس کی کلائی کو جھٹکا دے کر ناکارہ کرتا، فرش پر بہت سی کاچی کی چوڑیاں اور ٹنگن ٹوٹ کر گرنے کی آواز گونجی۔ میں نے گھبرا کر ہاتھ چھوڑ دیا۔ سیاہ شال کے نیچے سے ایک سسکی سی ابھری۔ میں نے دوسرے ہاتھ سے اجنبی کی چادر الٹادی۔ فضا میں ایک کوند سا پاکیا اور کسی کی سنہری زلفیں تیز ہوا سے اڑیں اور کسی چاند چہرے سے لپٹ کر خود نقاب بن گئیں۔ وہ فضا تھی جو اس قدر خوف زدہ ہو چکی تھی کہ اس کے کانپنے لہروں سے آواز تک نہیں نکل پا رہی تھی۔ اس کی کلائی سے چوڑیاں ٹوٹنے کی وجہ سے خون کی ایک پتلی سی لکیر ابھر کر بننے کو تیار تھی۔ میں نے اس سے پہلے آج تک کبھی بھی فضا کو بنا اس کا رُف یا کھلے بالوں کے ساتھ نہیں دیکھا تھا۔ وہ ہمیشہ اپنے سر کو ڈھانپنے رکھتی تھی۔ میرے سامنے لرزتی کانپتی سی ایک نئی فضا کھڑی تھی۔ اس سے پہلے وہ خوف کے مارے بے ہوش ہو کر گر پڑتی میں نے جلدی سے اسے شانوں سے پکڑ کر جھنجھوڑا۔

”ہوش میں آئیے..... یہ میں ہوں..... آیان.....“

فضہ نے ایک جھرجھری سی لی۔ میں نے جلدی سے اپنی جیب سے رومال نکال کر اس کی کلائی پر باندھا ”آپ اس وقت آدمی رات کو یہاں کیا کر رہی ہیں؟“ وہ ہٹکائی ”میں..... میں تو لاہوری سے چند کتابیں لینے اور پرانی واپس رکھنے آئی تھی..... دراصل میرے بھائیوں کو میرا دن کے وقت یہاں مردانے کی لاہوری میں آنا پسند نہیں ہے..... اس لیے میں چھپ کر رات کو یہاں آتی ہوں..... ہفتے میں دو مرتبہ.....“ میری نظر فضہ کے دوسرے ہاتھ میں پکڑی ایک کتاب پر پڑی ”لیکن آپ اس وقت یہاں کیا کر رہے ہیں.....؟“ ”مجھ سے کوئی جواب نہیں بن پایا..... میں..... میں تو آہٹ بن کر اوپر آ گیا تھا۔ میں سمجھا کوئی اجنبی کسی غلط ارادے سے حویلی میں آگھسا ہے.....“ دفعۃً فضہ کو اپنے پلو اور کھلے سر کا خیال آیا اور اس نے جلدی سے خود کو اسی بڑی شال سے ڈھانپ لیا۔ ہم دونوں ہی بڑی عجیب سی صورت حال میں پھنسے ایک دوسرے سے نظریں چرا





بنیاد پر اونچ نیچ سخت زہر لگتی تھی۔۔۔۔۔ وہ بھی بالکل آپ جیسا تھا۔ ”فضہ اپنی رو میں کچھ کہتے کہتے رک سی گئی۔ میں نے اس کے چہرے کے اترتے چڑھتے رنگ کو بخور دیکھا۔ ”یہ فرہاد کون ہے۔۔۔۔۔؟“ فضہ نے مجھ سے نظریں چرا لیں ”ہے نہیں۔۔۔۔۔ تھا۔۔۔۔۔ تہران یونیورسٹی میں میرا ہم جماعت تھا۔ میرا بہترین دوست۔۔۔۔۔ میرا ہم نفس۔۔۔۔۔“

”تھا کیوں۔۔۔۔۔ ہے کیوں نہیں۔۔۔۔۔؟“ فضہ دور خلا میں دیکھ رہی تھی ”آغا جان کو میرا اس سے ملنا جلنا پسند نہیں تھا۔ وہ غریب تھا مگر اس کے خیالات انقلابی تھے۔۔۔۔۔ اور رئیس دامراء کو انقلاب ذرا کم ہی بھاتا ہے۔۔۔۔۔“ میں نے چونک کر اسے دیکھا۔

”تو آپ نے ہتھیار کیوں ڈال دیے۔۔۔۔۔ آپ بھی اس انقلاب میں فرہاد کی مددگار کیوں نہیں بن گئیں۔۔۔۔۔؟“ فضہ اداس ہو گئی۔

”انقلابیوں کی کوئی منزل نہیں ہوتی۔۔۔۔۔ کبھی کبھی انقلاب تین چار نسلوں تک صرف ایک سراب ہی رہتا ہے۔ میں اس کے ساتھ چلنے کے لیے تیار تھی۔۔۔۔۔ مگر وہ مجھے ان کانٹوں میں گھسیٹنے کے حق میں نہیں تھا۔ لہذا چپ چاپ سب چھوڑ چھاڑ کر اپنی تعلیم مکمل کرنے کے لیے وظیفے پر جرمنی چلا گیا، اور میں دو سال بعد آغا جان کے اصرار پر یہاں آ گئی۔ تب سے ہمارا کوئی رابطہ نہیں رہا۔۔۔۔۔“ فضہ نے آج پہلی بار اپنا دل میرے سامنے کھولا تھا۔ تو اس نازنین کو بھی دنیا میں منفرد اور جدار کھنے والا یہ ”محبت“ نامی پارس ہی تھا۔ ہاں۔۔۔۔۔ سچ ہے۔۔۔۔۔ محبت کی تاثیر بھی تو پارس پتھر جیسی ہی تھی۔ جس نے آج تک جس کسی کو بھی چھو اُسے سونا کر دیا، لیکن اس کے اندر سے روح کھینچ لی۔ دنیا کے سبھی محبت کرنے والے اس پارس سے چھو جانے کے بعد بنا روح اور جان کے سونے کی مورتیوں جیسی زندگی ہی تو گزارتے ہیں۔ میں نہ جانے کن خیالات میں کھویا رہا اور مجھے پتہ بھی نہیں چلا کہ فضہ مجھے غور سے دیکھ رہی ہے۔

”کیا آپ کی زندگی میں بھی کوئی ہے یا تھا جس کے لیے آپ کی یہ آنکھیں بار بار جھلما سی جاتی ہیں۔۔۔۔۔“

میں نے چونک کر جلدی سے آنکھیں مٹا دیں۔۔۔۔۔ کبھی کبھی ہماری نظریں ہمیں چلتا پھرتا اشتہار بنادیتی ہیں۔ ”پتا نہیں۔۔۔۔۔ وہ بھی کبھی نہیں۔۔۔۔۔ محبت ایک طرفہ ہو تو اس کا نام محبت نہیں الزام رکھ دینا چاہئے۔۔۔۔۔ مجھ پر بھی اسی ادھوری محبت کا الزام ہے۔۔۔۔۔ اور شاید سدا رہے گا۔“ میں نے فضہ کو گہنا کے بارے میں مختصر بتا دیا۔ وہ چپ چاپ سنتی رہی۔ میں نے رنگا کے اڑے سے تعلق کے علاوہ اسے یہ بھی بتایا کہ ستارہ کا یہ کہنا ہے کہ کبھی کبھی محبت ہم پر ظاہر ہونے اور اپنا آپ منوانے میں بہت وقت لیتی ہے، اور کبھی کبھی خود ہمارے اندر کی یہ دیرکئی بازیاں پلٹ دیتی ہے۔ لیکن میں تو پیار کی پہلی بازی ہی اس بری طرح ہارا تھا کہ اب کسی اور محبت کی گنجائش ہی کب بچی تھی میرے اندر۔ مجھے تو اب اس لفظ محبت سے ہی خوف محسوس ہوتا تھا۔ اس دن میں فضہ کے پاس سے اٹھ تو آیا لیکن ہم دونوں کے اندر کئی خلا اور کئی سوال تشنہ رہ گئے تھے۔

شام کو نواب صاحب بھی مردان خانے والی اپنی خواب گاہ میں منتقل ہو چکے تھے اور مردان خانے کے نوکروں کی جان پر بنی ہوئی تھی۔ شبنم ڈانٹ ڈانٹ کر سب کو حکم دے رہا تھا۔ نوازی کی تیز نظریں سب پر جمی ہوئی تھیں۔ نواب کے دونوں بیٹے بھی رات کے کھانے پر موجود تھے لیکن دونوں کے انداز میں سرد مہری نمایاں تھی۔ کھانے کے بعد نواب صاحب نیند کا بہانہ کر کے جلدی اٹھ گئے اور اپنی خواب گاہ کی جانب بڑھ گئے میں نے قہوے کے دور چلنے تک کچھ توقف کیا اور پھر میں بھی اجازت لے کر اٹھ آیا۔ کسی کو پتہ نہیں چل پایا کہ پاشا صاحب نے نواب صاحب کو کس وقت میرے

کمرے میں منتقل کیا اور کب میں اپنے کمرے کی جانب جاتے جاتے نواب صاحب کی خواب گاہ میں داخل ہو گیا۔ دونوں ہی کمرے چلی منزل پر تھے اور تقریباً ایک دوسرے کے بالاقابل بھی تھے۔ میں نے کمرے میں داخل ہوتے ہی صفر کے ایک بلب کے علاوہ باقی تمام روشنیاں گل کر دیں۔ پتہ نہیں کیوں آج میرا دل کسی انہونی کی گواہی دے رہا تھا۔ میں نے خود کو بستر پر ڈال دیا اور آنکھیں موندھ کر اپنے اندر کے اندھیروں سے لڑتا رہا۔ رات کے دو بج چکے تھے اور اب گھڑیال کی ٹک ٹک باقاعدہ میرے ذہن پر کسی ہتھوڑے کی طرح بج رہی تھی۔ اچانک کمرے کی باغیچے کی جانب کھلنے والی بالکنی میں ہلکا سا کھٹکا ہوا۔ آواز بہت مدہم اور خفیف سی تھی اگر میں ہلکی سی غنودگی میں بھی ہوتا تو مجھے ہرگز پتہ نہ چلتا۔ میں نے اپنی سانس روک لی۔ اندھیرے میں ایک ہاتھ کھڑکی کی ہلکی سی کھلی درز سے اندر داخل ہوا مطلب وہ جو کوئی بھی تھا اس نے اپنے اندر آنے کا راستہ پہلے سے ہی ہموار کر رکھا تھا۔ میرا دل تیزی سے دھڑکا۔



## دجال (شیطان کا بیٹا)

انگریزی ادب سے درآء ایک خوفناک ناول۔ علیم الحق حقّی کا شاندار اندازِ بیاں۔ شیطان کے پجاریوں اور پیرو کاروں کا نجات دہندہ شیطان کا بیٹا۔ جسے بائبل اور قدیم صحیفوں میں بیسٹ (جانور) کے نام سے منسوب کیا گیا ہے۔ انسانوں کی دُنیا میں پیدا ہو چکا ہے۔ ہمارے درمیان پرورش پا رہا ہے۔ شیطانی طاقتیں قدم قدم پہ اسکی حفاظت کر رہی ہیں۔ اسے دُنیا کا طاقتور ترین شخص بنانے کے لیے مکروہ سازشوں کا جال بنا جا رہا ہے۔ معصوم بے گناہ انسان، دانستہ یا نادانستہ جو بھی شیطان کے بیٹے کی راہ میں آتا ہے، اسے فوراً موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا ہے۔

دجال..... یہودیوں کی آنکھ کا تارہ جسے عیسائیوں اور مسلمانوں کو تباہ و برباد اور نیست و نابود کرنے کا مشن سونپا جائے گا۔ یہودی کس طرح اس دُنیا کا ماحول دجال کی آمد کے لیے سازگار بنا رہے ہیں؟ دجالیت کی کس طرح تبلیغ اور اشاعت کا کام ہو رہا ہے؟ دجال کس طرح اس دُنیا کے تمام انسانوں پر حکمرانی کرے گا؟ 666 کیا ہے؟ ان تمام سوالوں کے جواب آپ کو یہ ناول پڑھ کے ہی ملیں گے۔ ہمارا دعوئی ہے کہ آپ اس ناول کو شروع کرنے کے بعد ختم کر کے ہی دم لیں گے۔ دجال ناول کے تینوں حصے کتاب گھر پر دستیاب ہیں۔

## باب 23

آنے والے نے خود کو نقاب اور ایک کالی چادر سے ڈھانپ رکھا تھا۔ سیاہ رنگ شاید اپنے اندر مدغم ہو جانے والا سب سے زیادہ گہرا رنگ ہوتا ہے۔ سچی تو اس کی رات کے اندھیرے سے اس قدر رد و قوتی ہوتی ہے۔ نقاب پوش نے نہایت احتیاط سے ہر مقام پر رک کر اطمینان کیا کہ کہیں اس کی کوئی آہٹ سونے والے کو ہوشیار نہ کر دے۔ میں نے جسم پر بڑی چادر کو اس طرح چہرے تک اوڑھ لیا تھا کہ صرف ایک ہلکی سی جھری باقی تھی جس کے ذریعے مجھے اس کی حرکات و سکنات کی ایک نامکمل سی جھلک نظر آ رہی تھی۔ دفعۃً مجھے نقاب پوش کے ہاتھ میں کسی خنجر کی دھار صفر کے بلب کی ادھوری روشنی میں چمکتی نظر آئی۔ میرا سارا جسم اکڑنے لگا۔ مجھے اپنی موت کو اپنے اس قدر نزدیک آنے دینا تھا کہ وہ قاتل میرے ہاتھوں سے نکل کر مجھ سے قضا نہ ہو جائے اور اس کے لیے مجھے اس کے قدموں کو گھسنے رہنا تھا کیونکہ چادر کے نیچے سے اب وہ مجھے کسی پر چھائیں کی طرح بھی دکھائی نہیں دے پارہا تھا۔ میں نے موسیٰ کا سبق یاد کیا..... اندھیرے میں دشمن کی چاپ اور اس کی سانس کے ہانپنے کی آواز سے اس کا اندازہ لگاتے رہو اور ٹھیک وقت پر اس پر جھپٹ پڑو..... لیکن یاد رہے کہ اندھیرے میں کیے گئے وار سے دونوں کو بیک وقت ایک جیسا خطرہ رہتا ہے۔ لہذا ہاتھ چوک گیا تو سمجھو کہ کھیل ختم..... میں نے دل ہی دل میں الٹی گنتی شروع کر دی۔ ”پانچ، چار، تین، دو..... ایک..... اور اچانک ہی میں نے چادر الٹ کر پھینک دی۔ ٹھیک میرے اندازے کے مطابق نقاب پوش کا ہاتھ مجھ پر حتمی وار کے لیے فضا میں بلند ہو چکا تھا۔ میرے کروٹ لینے اور اس کے گھبرا کر تیزی سے نیچے آتے ہاتھ میں شاید سیکنڈ کے کسی ہزارویں حصے کا فرق تھا۔ میں نے کروٹ لی اور خنجر میرے کرتے کو چیرتا ہوا بستر کے نرم نوم میں دھنس گیا۔ نقاب پوش نے گھبرا کر خنجر دوبارہ نکالنے کی کوشش کی لیکن تب تک میرا ہاتھ اس کی کلائی کو جکڑ چکا تھا کہتے ہیں وحشت میں انسان کی طاقت دوگنی ہو جاتی ہے۔ اس کا مظاہرہ میرے سامنے تھا۔ دوسرے ہی لمحے نقاب پوش باقاعدہ اپنی پوری قوت سے مجھ پر اپنا سارا بوجھ ڈال چکا تھا۔ اس کا نولادی گھٹنا ٹھیک میری شہ رگ کے اوپر اپنا قاتل دباؤ بڑھا رہا تھا جب کہ وہ دوسرے ہاتھ سے اپنے خنجر کو پھر سے تولنے کی کوشش میں مصروف تھا۔ موسیٰ ہمیشہ کی طرح میرے ذہن میں اپنے تمام داؤد اور گروں کے ساتھ موجود تھا۔

”نڈھال پڑنے لگو تو بازی پلٹنے سے پہلے اپنی تمام طاقت مجتمع کر کے مخالف پر پل پڑو..... یاد رہے..... کبھی کبھی زیادہ دیر تک خود کو روک کے رکھنا بھی مات کا باعث بن سکتا ہے.....“ میں نے اب تک اس بات کا خاص خیال رکھا تھا کہ نقاب پوش کو کوئی ایسی چوٹ نہ لگ جائے جو جان لیوا ثابت ہو سکتی ہو کیونکہ اس کی موت سے ہمارا مقصد حل نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ زندہ رہتا تو ہمیں بہت سے راز کھول جاتا، لیکن اب میں نے یہ احتیاط ترک کر کے اس سے نپٹنے کا فیصلہ کر لیا اور خود کو تول کر پوری قوت سے اسے پیچھے کی جانب اچھال دی۔ خنجر اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر کہیں دور جا گرا اور پھر میں نے اسے اٹھنے کا موقع نہیں دیا۔ میری ٹھوکروں نے تھوڑی ہی دیر میں اسے باوازا بلند چیخنے پر مجبور کر دیا۔ اس نے کھڑکی کی جانب کود کر باہر بھاگنے کی کوشش کی لیکن اس کی کلائی پر میری گرفت بہت مضبوط تھی۔ فضا میں ہڈی ترخنے کی آواز گونجی اور اس کے منہ سے ایک بلند چیخ ابھری اور وہ اپنا ہاتھ پکڑ کر وہیں نڈھال ہو کر



گر پڑا۔ اس عرصے میں اس تمام شور و غل سے حویلی کے مردان خانے کے کبھی افراد جاگ کر میرے دروازے پر جمع ہو کر بری طرح سے پیٹ رہے تھے میں نے آگے بڑھ کر نقاب پوش کے چہرے سے نقاب کھینچ لیا، اور میرے منہ سے بے اختیار نکلا ”رحیم۔ تم۔ مگر۔ مگر کیوں۔“ میں نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔ سب سے آگے نواب صاحب اور ان کے عقب میں دونوں بیٹے۔ پاشا اور نواز سمیت کبھی تیزی سے کمرے میں گھس آئے۔ ان کے سامنے حویلی کا سب سے پرانا اور بظاہر سب سے زیادہ خدمت گار اور وفادار ملازم رحیم جو حویلی میں منجبر کی حیثیت سے برسوں سے یہاں موجود تھا اس وقت زمین پر آڑھ ہاتر چھا پڑا اور دسے کر رہا رہا تھا۔ نواب صاحب تو نڈھال ہو کر وہیں ڈھے سے گئے ”رحیم۔ تم نے یہ سب کیوں کیا۔ میری شفقت میں کیا کئی رہ گئی تھی۔“ بولو۔ جواب دو۔“ لیکن نواب صاحب کے سوال کے جواب میں رحیم کے پاس ایک خاموشی تھی۔ نواب کے بیٹے چلائے ”یہ سب کیا ہو رہا ہے۔۔۔۔۔ اس لڑکے نے رحیم کی یہ حالت کیوں بنائی ہے۔ یہ سب حویلی میں کیا چل رہا ہے۔۔۔۔۔؟“

نواب صاحب نے سب کو واپس اپنے اپنے کمروں میں جانے کا حکم دے دیا ”اس وقت کچھ بھی کہنا مناسب نہیں ہوگا۔ کل صبح دس بجے مرکزی دالان میں سب کے سامنے یہ راز بھی کھول دیا جائے گا۔ فی الحال آپ سب اپنے اپنے کمروں میں جا کر آرام کریں۔ میں تنہائی میں رحیم سے کچھ بات کرنا چاہتا ہوں۔“

وقار اور سجاد نہ چاہتے ہوئے بھی بڑبڑاتے ہوئے کمرے سے نکل گئے اور پھر سب نوکر ایک ایک کر کے وہاں سے چل دیے۔ نواب صاحب نے آخر میں مجھے اور پاشا صاحب کو وہیں روک لیا۔

رحیم اب سکڑ سٹ کر وہیں دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ چکا تھا۔ میں نے سب کے جانے کے بعد دروازہ بند کر دیا اور نواب صاحب کی طرف پلٹا ”نواب صاحب۔۔۔۔۔ آپ کا دشمن آپ کے سامنے ہے لیکن اس پر میرا راز بھی افشا ہو چکا ہے۔ لہذا اب اس کا زندہ رہنا ہم میں سے کسی کے مفاد میں نہیں۔ بہتر یہی ہے کہ اس کی قبر ہمیں حویلی کے پچھواڑے بنادی جائے باقی سب سارنگا استاد سنبھال لے گا۔“ سارنگا کا نام سن کر رحیم کے ساکت جسم میں ایک جھرجھری ہی پیدا ہوئی۔ پاشا صاحب میرا اشارہ سمجھ چکے تھے۔ انہوں نے بھی میری تائید کی۔ ”ہاں۔۔۔۔۔ آیان ٹھیک کہہ رہا ہے نواب صاحب۔۔۔۔۔ اب یہ کھیل ہمیں ختم ہو جائے تو بہتر ہے۔ آپ کا مسئلہ تو حل ہو ہی چکا۔“ نواب صاحب کو اب ہماری منشا سمجھ میں آئی اور انہوں نے ایک لمبا سا سانس لیا ”ٹھیک ہے۔۔۔۔۔ اگر آپ دونوں کی یہ مرضی ہے تو یوں ہی سہی۔ لیکن دھیان رہے۔ یہ میرا بہت پرانا آدمی ہے۔۔۔۔۔ زیادہ تکلیف نہ ہو۔“ نواب صاحب واپس جانے کے لیے پلٹے اور رحیم لپک کر ان کے قدموں سے لپٹ گیا ”خدا کے لیے۔۔۔۔۔ مجھے ان کے حوالے کر کے نہ جائیں۔۔۔۔۔ مجھ سے بہت بڑی بھول ہو گئی صاحب۔۔۔۔۔ میں سب بتانے کے لیے تیار ہوں۔۔۔۔۔ مجھے اس کام کے لیے نواب بیگم نے اکسایا تھا۔“ ہم سب کے سروں پر ایک ہم جیسے پھونکا اور ہم سب ساکت کے ساکت کھڑے رہ گئے، لیکن سب سے زیادہ صدمے کا شکار نواب صاحب تھے۔ وہ بمشکل قریبی صوفے تک پہنچے اور بنا کچھ کہے وہیں ڈھے گئے۔ پاشا صاحب ان کی حالت دیکھ کر بوکھلا گئے اور بڑی مشکل سے ہم نے انہیں چند گھونٹ پانی پلا کر کچھ دیر کے لیے لٹا دیا۔ رحیم جو اپنے مالک کی جان لینے کے درپے تھا اور چند لمحے پہلے ان کے سینے میں خنجر گھونپنے کے لیے بے تاب تھا اب خود روتے ہوئے تیزی سے بھاگ بھاگ کر نواب صاحب کی خدمت کر رہا تھا۔ ان کے ہاتھ پاؤں مل کر انہیں ہوش میں لانے

کی کوشش کر رہا تھا اور نہ جانے دل ہی دل میں کون کون سی دعائیں پڑھ کر ان پر پھونک رہا تھا۔ انسان کے کتنے رنگ ہیں یہ شاید کبھی کوئی نہ جان پائے۔ شیطان اور رحمان کتنے ٹکڑوں میں بٹ کر اس کے اندر پلٹے ہیں اس کا اندازہ آج تک کوئی نہیں لگا پایا۔

خدا خدا کر کے دو گھنٹے بعد نواب صاحب کی طبیعت کچھ سنبھلی، لیکن اب وہ ایک ہارے ہوئے جوار کی طرح خاموش بیٹھ رہے۔ رحیم نے دھیرے دھیرے ساری بات کھول دی کہ نواب خاتون کے دل میں یہ خناس آج کا نہیں بلکہ برسوں پرانا ہے جب ان کے شوہر یعنی نواب صاحب کے بڑے بھائی نواب امیر الملک کا ایک حادثے میں انتقال ہوا تھا۔ دونوں بھائی شکار کے لیے گھر سے نکلے اور پھر بھوپال کے جنگلات میں سے ان دو میں سے ایک بھائی ہی واپس گھر پہنچا تھا۔ کہتے ہیں کہ اوپچی چان کا عین شیر کے حملے کے وقت ٹوٹ جانا اور بڑے بھائی کا زمین پر گر جانا اس حادثے کا باعث بن گیا تھا۔ اس وقت رحیم کا باپ جوان دو بھائیوں کی نیجری کرتا تھا وہ بھی اپنے بڑے مالک کو بچانے کے لیے نیچے کود گیا مگر افسوس دونوں میں سے کوئی نہیں بچ پایا۔ جنگل سے دو لاشیں گھر پہنچیں تو ایک کھرام مچ گیا۔ تین دن تک تو نواب خاتون کو کوئی ہوش ہی نہیں تھا۔ پھر نہ جانے کس بدخواہ نے ان کے کان میں یہ بات ڈال دی کہ بھائی کی مدد کو نیجیر کے بجائے چھوٹا بھائی کیوں نہیں کول۔ رفتہ رفتہ یہ سوال ان کے اندر پک پک کرنا سوسر بٹا چلا گیا اور انہیں یقین ہو گیا کہ دولت، جائیداد اور جاگیر کی خاطر چھوٹے بھائی نے بڑے بھائی کو مار ڈالا، اور پھر نواب خاتون نے اپنے اس خود ساختہ یقین کے سہارے نواب دیر اور ان کے پورے خاندان سے انتقام لینے کی ٹھان لی۔ گھر کے اندر دونوں بھائیوں میں سدا کے لیے پھوٹ ڈال کر انہوں نے ہر طرح سے گھر کا سکون ہمیشہ کے لیے برباد کیے رکھا لیکن ایک عورت ہونے کی وجہ سے ان کی بھی کچھ مجبوریاں تھیں لہذا انہوں نے رحیم کو اپنے ساتھ ملانے کا منصوبہ بنایا۔ رحیم کا باپ بھی اس حادثے میں اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا اور رحیم کو اس کے باپ کی وفاداری کے صلے میں نیجری کی نوکری دی گئی تھی، لیکن نواب خاتون نے رحیم کے دل میں شک کا بیج بو دیا کہ وہ دونوں کسی حادثے میں نہیں بلکہ باقاعدہ ایک منصوبے کے تحت موت کے گھاٹ اتارے گئے تھے، اور پھر آخر کار شک کا وہ کڑوا زہر رحیم کی رگوں میں بھی پھیلتا چلا گیا کہ اس کے باپ کا قاتل بھی نواب دیر ہی ہے۔ لہذا اس نے نواب خاتون کا ساتھ دینے کی ہامی بھری۔ تب سے اب تک وہ نواب پر تقریباً سات وار کر چکا تھا مگر نواب کی تقدیر ہمیشہ نواب خاتون کی تدبیر کے آڑے آتی رہی اور آج آخر کار اس کہانی کا انجام بھی ہمارے سامنے تھا۔

رحیم بات ختم کر کے سر گھٹنوں میں دیے بیٹھا روتا رہا۔ نواب صاحب نے ہم سے درخواست کی کہ وہ کچھ دیر کے لیے تنہا رہنا چاہتے ہیں لہذا ہم اب اپنے کمروں میں جا کر آرام کریں اور انہیں تنہا چھوڑ دیں۔ رحیم سے انہوں نے بس اتنا کہا کہ وہ آزاد ہے۔ جہاں جانا چاہے جاسکتا ہے۔ ہمارے کمرے سے نکلنے کے بعد انہوں نے اندر سے دروازہ بند کر لیا۔ پاشا صاحب ان کی ذہنی حالت کے مد نظر بہت سے شکوک و شبہات کا شکار تھے۔ خود میرے دل میں بھی صبح تک عجیب عجیب دوسے آتے رہے اور پھر دس بجے دشمن تیزی سے بھاگتا ہوا میرے کمرے میں داخل ہوا۔ اس کی سانس پھولی ہوئی تھی۔

”وہ نواب صاحب..... نواب صاحب.....“ میں گھبرا کر اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔.....

”کیا ہوا نواب صاحب کو.....“



## باب 24، 25

چند لمحے کے لیے تو مجھے یوں لگا کہ میرے سارے حواس ہی معطل ہو چکے ہیں۔ میں نے شہین کو ڈانٹا ”بولتے کیوں نہیں.....؟“۔ نواب صاحب ٹھیک تو ہیں نا.....!“ شہین نے اپنی سانس درست کی ”کیا کہوں کہ ٹھیک ہیں بھی یا نہیں..... لگتا ہے ساری رات کسی شدید کرب میں روتے رہے ہیں۔ انہوں نے حویلی کے زنانے اور مردانے کے سبھی لوگوں کو بڑے دالان میں جمع کرنے کا کہا ہے مجھے..... سچ..... آج تو مجھے ان سے شدید خوف محسوس ہو رہا ہے.....“ شہین مجھے اطلاع دے کر باقی لوگوں کو بلانے کے لیے اٹھے پاؤں دوڑ گیا۔ نواب صاحب نے حویلی کے سبھی افراد کو ایک ساتھ کیوں طلب کیا ہے؟..... میں یہی سوچتے ہوئے کچھ دیر بعد زمر حویلی کے مرکزی دالان میں پہنچا تو فضا، خانم، نواب کے بیٹوں سمیت حویلی کا ہر فرد چھوٹے بڑے سبھی ملازم، نواز اور اس کا عملہ، حتیٰ کہ دربان بھی وہاں موجود تھے۔ ایک جانب رحیم بھی گرم سم سا کھڑا تھا۔ اس نے نواب کی پیشکش کے باوجود فرار کی راہ اختیار نہیں کی تھی۔ کہتے ہیں انسان کا سب سے بڑا فرار خود اس کے اندر لگے آئینے سے اوجھل ہونا ہوتا ہے۔ اگر کوئی اس آئینے سے نہ چھپ سکے تو پھر دنیا کے سبھی فرار پس برائے نام ہیں۔ کوئی چھپنے کی کوشش کرے تو خود سے چھپے ورنہ خود کو تھکا نالا حاصل ہے، اور پھر کچھ دیر بعد نواب خاتون بھی اُٹھتے ہوئے چہرے اور سوجی ہوئی سرخ آنکھوں کے ساتھ وہاں آ گئیں۔ ان کی آمد پر حسب معمول نواب دبیر سمیت حویلی کے ہر فرد نے انہیں اٹھ کر تعظیم دی۔ نواب خاتون کی وہ دو مخصوص خادماں جو ہمیشہ ان کے ساتھ ہوتی تھیں آج بھی ان کے پیچھے دائیں بائیں موجود تھیں مطلب ان سے ابھی تک ”مرعات“ واپس نہیں لی گئیں تھیں، لیکن نواب خاتون کا چہرہ بتا رہا تھا کہ انہیں رحیم کے ذریعے ساری بات کھل جانے کی اطلاع مل چکی ہے لیکن میں نے آج بھی نواب صاحب کو ان کی تعظیم کے لیے اٹھتے دیکھا تو مجھے ریت رواجوں میں بندھے اس شخص کے لیے خود اپنے دل میں بڑی قدر محسوس ہوئی۔ نواب دبیر واقعی ایک اعلیٰ ظرف انسان تھے۔

نواب صاحب نے کچھ دیر تک سب کے بیٹھ جانے کا انتظار کیا۔ پھر انہوں نے پاشا صاحب کو تہنید باندھنے کا اشارہ کیا۔ پاشا صاحب اٹھ کر نواب صاحب کے ساتھ سب کے سامنے جا کھڑے ہوئے ”آج چند ایسی باتیں آپ لوگوں کے علم میں آئیں گی جس سے آپ میں سے کوئی بھی پہلے واقف نہیں تھا۔ دراصل کچھ عرصے سے نواب صاحب کی زندگی کو شدید خطرات لاحق ہو گئے تھے۔ کوئی ان دیکھا دشمن نواب صاحب کی زندگی کے درپے تھا اور وہ جتنے بھی حادثے آج تک اس حویلی میں اتفاقاً سمجھے گئے تھے وہ سب کے سب اس اجنبی قاتل کی نواب صاحب کی جان لینے کی کوششیں تھیں۔“ سارے مجمعے کو جیسے سانپ سا سونگھ گیا اور پھر سبھی نے سرگوشتیوں میں ایک دوسرے سے کچھ پوچھنا شروع کر دیا۔ خانم پریشانی میں اپنی جگہ کھڑی ہو گئیں۔ ”نواب صاحب..... یہ سب کیا ہے..... یہ پاشا صاحب کیا کہہ رہے ہیں.....؟“ نواب صاحب نے خانم سے بیٹھ جانے کی درخواست کی۔ پاشا صاحب نے اپنی بات جاری رکھی۔

”آپ سب کو پہلے اس حقیقت سے اس لیے آگاہ نہیں کیا گیا کیونکہ نواب صاحب اس بات کی تشہیر اور حویلی کی بدنامی کو روکنا چاہتے تھے



اور پھر شروع میں تو خود نواب صاحب بھی اس بات سے لاعلم تھے کہ یہ سب کچھ باقاعدہ کسی منصوبے کے تحت کیا جا رہا ہے، لیکن تیسرے حادثے کے بعد ہم یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ ضرور دال میں کچھ کالا ہے۔ لہذا نواب صاحب اپنے طور پر محتاط تو ہو گئے لیکن وہ انجانا دشمن وار کرنے سے نہیں رکا۔ لہذا میں نے اور نواب صاحب نے طے کیا کہ ہمیں پولیس یا کو توالی کو درمیان میں ڈالے، یا اس دشمن کو کھوجنا ہو گا تا کہ گھر کی بات گھر میں ہی رہے اور باہر کوئی نئی داستان نہ بن پائے۔ اس کام کے لیے ہم نے زیر زمین دنیا سے رابطہ کیا اور ایک مہربان کی وساطت سے آیاں میاں کو فوضہ بیٹا کے اتالیق کے روپ میں حویلی میں مدعو کیا گیا، لیکن وہ دراصل نواب صاحب کی جان کے دشمن کے خاتمے کے لیے یہاں بلائے گئے تھے۔ اس لمحے میں نے فوضہ کے چہرے پر بہت سے رنگ آکر جاتے دیکھے۔ اس نے کچھ ایسی نظر سے میری طرف دیکھا جس کا بیان ممکن نہیں۔۔۔۔۔ پاشا صاحب فوضہ کے دل کی حالت سے بے خبر ہو لیتے رہے۔

”اور پھر آخر کار کل رات آیاں کو اپنے مقصد میں کامیابی حاصل ہو ہی گئی۔ انہوں نے اپنی جان پر کھیل کر اور خود نواب صاحب کی خواب گاہ میں اپنے آپ کو شکار کے لیے پیش کر دیا اور وہ انجانا دشمن اس وقت رحیم کی صورت میں آپ کے سامنے موجود ہے۔“ سب ہی کی نفرت بھری نگاہیں رحیم پر تنگ گئیں۔ نواز کا تو بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ اسی وقت رحیم سے وہیں سارے حساب بے باک کر لے۔ پاشا صاحب نے رحیم کی سنائی ہوئی داستان ایک بار پھر سے سب کو سنادی کہ اس دشمنی کی ابتداء بھوپال کے حادثے سے ہوئی اور اس کا انجام کل رات نواب کی خواب گاہ میں کیسے ہوا۔ اس تمام عرصے کے دوران نواب خاتون بالکل خاموش اور ساکت سی بیٹھی رہیں۔ پاشا صاحب نے اپنی بات ختم کی تو بہت دیر تک ماحول پر خاموشی چھائی رہی۔ نواب صاحب خود بھی مضحل سے کھڑے تھے جیسے ان کا دل مردہ ہو چکا ہو۔ انہوں نے پاشا صاحب کو اشارہ کیا اور پاشا صاحب نے دوبارہ کلام کا سلسلہ جوڑا ”جس حادثے پر قتل کا شک کیا جا رہا ہے اس کا ایک یعنی گواہ جو بھوپال کے جنگل میں اس شکار کے دوران بڑے نواب یعنی نواب خاتون کے شوہر نواب امیر الملک کا سب سے قابل اعتماد ساتھی بھی تھا اور نواب امیر الملک کے دائیں بازو کے طور پر مشہور تھا۔ اس کا نام اکبر ہے۔ جسے نواب صاحب نے راتوں رات اپنی خصوصی گاڑی بھیج کر یہاں سے تین گھنٹے دور کی مسافت پر اس کے قصبے سے بلوایا تھا اور وہ اب سے کچھ دیر پہلے ہی یہاں پہنچا ہے۔“ پاشا کے اشارے پر نواز نے اپنے عقب میں کھڑے ایک بہت ضعیف شخص کو آگے آنے کا اشارہ کیا۔ اکبر کو دیکھ کر پہلی مرتبہ نواب خاتون کے چہرے پر حیرت اور یاد ماضی کے کچھ آثار نمودار ہوئے۔ اکبر سلام کر کے ایک جانب کھڑا ہو گیا۔ پاشا نے کہا ”اس روز بھوپال کے جنگل میں جو کچھ بتا اکبر نے خود اسے اپنی آنکھوں سے دیکھا اور آج آپ کے سامنے وہ پھر سے وہی سب بیان کرے گا۔ یاد رہے کہ یہی وہ اکبر ہے جس پر نواب امیر اس قدر بھروسہ کرتے تھے کہ ان کی خواب گاہ کی ایک کچی ہمیشہ اکبر کے پاس رہتی تھی۔ اکبر دو قدم آگے بڑھ آیا اور اس نے کانپتی ہوئی آواز میں اس شام کا ذکر چھیڑ دیا۔ چنانچہ اکبر نے جنگل کے دیگر شکاری کارندوں کے ساتھ مل کر بندھوائی تھی اور اس کے ٹوٹنے کی بات درست نہیں تھی۔ دراصل نواب امیر نشانہ لینے کے لیے خود خطرناک حد تک آگے کو جھکے ہوئے تھے اور کنارے کی لکڑی اتنا بوجھ سہار نہ سکی اور چیخ کر علیحدہ ہو گئی۔ ٹھیک اسی لمحے شیر کا حملہ ہوا اور رحیم کا باپ جو اسی چنانچہ پر موجود تھا اپنے مالک کی مدد کے لیے نیچے کود گیا نواب دبیر کچھ فاصلے پر دوسری چنانچہ میں بیٹھے تھے اور انہی کی گولی نے شیر کو گھائل ہو کر بھاگنے پر مجبور کر دیا تھا۔ نواب دبیر نے نشانہ لینے اور گولی چلانے میں ایک بل کی دیر

بھی نہیں کی تھی لیکن جب تک وہ درندہ بڑے نواب اور رحیم کے باپ کو خاصا زخمی کر چکا تھا۔ نواب دیر نے اپنے بھائی کا بہت خون دیکھ کر اپنے حواس نہیں کھوئے اور جس قدر جلد ممکن ہو سکتا انہیں اپنی پیٹھ پر لا کر دو رکھپ میں کھڑی گاڑیوں تک پہنچے کیوں کہ گھنی جھاڑیوں اور درختوں کی وجہ سے گاڑی چان تک نہیں پہنچ سکتی تھی لیکن لمبے راستے کی وجہ سے ہسپتال تک پہنچنے ان دونوں کا خون اس قدر زیادہ بہہ چکا تھا کہ یکے بعد دیگرے دونوں مالک نوکر نے ہسپتال میں ہی جان ہار دی۔ اکبر نے اس غلط فہمی کو بھی دور کر دیا جو بڑے نواب کی موت کے بعد اس کی اچانک گم شدگی کی صورت میں افواہوں کا باعث بنی تھی۔ اس نے بتایا کہ بڑے نواب کے بعد اس کا دل ہی نہیں چاہا کہ وہ روزانہ اپنے مہربان مالک کی یادوں کو کریدنے کے لیے حویلی آئے لہذا اس نے چھوٹے نواب سے اجازت لے کر خود کو اپنے قصبے تک محدود کر لیا اور آج بھی وہ صرف اپنے مالک کے عزیز از جان چھوٹے بھائی پر لگے الزام کو دھونے کے لیے اپنے گھر سے نکلا ہے۔

ساری بات آئینے کی طرح واضح ہو چکی تھی۔ نواب صاحب نے کچھ دیر توقف کیا اور پھر جب وہ بولے تو برسوں کے بیمار لگ رہے تھے۔  
 ”میں نے نواب خاتون کو ہی ہمیشہ اس حویلی کا بڑا سمجھا ہے اور آج بھی وہی اس خاندان کی بڑی ہیں۔ کاش وہ اپنے دل کا یہ کائنات کبھی مجھے بھی دکھا پاتیں تو آج یہ نوبت نہ آتی۔ بہر حال دیر آمد، درست آمد۔ میں نے بھائی جان کی موت سے لے کر اب تک ان کے حصے کی ایک ایک پائی نواب خاتون کی خدمت میں ہی پیش کی ہے لیکن اگر وہ آج تک یہی سمجھتی رہیں کہ یہ سارا مکروہ کھیل ہی وراثت کا ہے تو آج میں نے ان کے نام یہ سادہ مختار نامہ (Power of Atrony) دستخط کر دیا ہے۔ وہ اس پر جو جی چاہے بھر کر اپنے نام کر سکتی ہیں۔ میں نے یہ زمر دحو لی بھی ان کے نام کر دی اور خود اگلے ماہ ایران منتقل ہو کر باقی ساری زندگی وہیں بسر کرنے کی ٹھان لی ہے۔ رحیم کو میں نے پہلے ہی معاف کر دیا ہے وہ چاہے تو اسی حویلی کے نیچر کے طور پر اپنی نوکری جاری رکھ سکتا ہے۔ میں نے نواب خاتون کو بھی معاف کیا اور ان سے بھی اپنے تمام حقوق بخشنے کی التجا کرتا ہوں.....“

بات ختم کرتے کرتے نواب صاحب کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو چکے تھے۔ پاشا نے جلدی سے انہیں سنبھالا ایک کونے میں کھڑا رحیم بھی رور ہا تھا اور پھر میں نے شہین سمیت حویلی کے سبھی ملازمین کی آنکھوں کو بھیگتے ہوئے دیکھا۔ حیرت ہے وہ ایک شخص جو اپنے غلاموں کے دلوں میں بھی بستا تھا۔ خود اپنے ہی خون کی نظروں میں ساری عمر کے لیے معتبہ ٹھہرا تھا۔

دفعۃً نواب خاتون اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئیں۔ ان کا سارا جسم لرز رہا تھا۔ ان کی زبان سے صرف اتنا ہی نکلا ”دیر میں تو تم سے معافی مانگنے کے قابل بھی.....“ اور اگلے ہی لمحے نواب خاتون زمین پر ڈھے پکی تھیں۔ ہم سب ان کی طرف دوڑے۔ نواب خاتون کے ہونٹ نیلے پڑ چکے تھے۔ ہلکا سا ہتکاف اس بات کی نشان دہی کر رہا تھا کہ شاید انہوں نے نواب صاحب کی جان لینے کے لیے جو ہر بچا رکھا تھا اسے وہ یہاں آنے سے پہلے خود گھول کر پی چکی تھیں۔ انتہائی غلٹ میں انہیں شہر کے ہسپتال میں منتقل کیا گیا اور وہاں چند گھنٹوں بعد انہوں نے آنکھیں بھی کھولیں، لیکن شاید یہ ان کے لیے قدرت کی جانب سے کفارے کے لیے دیا جانے والا آخری موقع تھا۔ انہوں نے اپنے سر ہانے بیٹھے نواب دیر سے ہاتھ جوڑ کر معافی مانگی اور پھر ہمیشہ کے لیے آنکھیں موندھ لیں۔ زمر دحو لی ایک بار پھر اُجڑ گئی۔ نواب خاتون نے اس روز بڑے دالان میں آنے سے پہلے ہی زہر چکھ لیا تھا۔ انہیں شبہ تھا کہ نواب دیر کبھی معاف نہیں کریں گے اور سارے زمانے میں ان کی رسوائی الگ ہوگی لہذا انہوں نے یہ آخری بازی مات

ہونے سے پہلے ہی اپنی زندگی کی بازی ہار جانے کا فیصلہ کر لیا۔ کاش وہ نواب صاحب کے ظرف کا تھوڑا سا بھی اندازہ کر لیتیں تو یہ سب کچھ نہ ہوتا، لیکن بات اگر ظرف کی شناخت کی ہی ہوتی تو وہ بھلا نواب دبیر کے خلاف اتنے سال تک اپنے دل میں یہ عداوت اور دشمنی ہی کیوں پالے رکھتیں.....؟؟

نواب خاتون کا تیسرا بھی ہو گیا اور حویلی کی وحشت اور ویرانی میں کوئی کمی نہیں ہو پائی۔ میں اب نواب صاحب سے اجازت لینا چاہتا تھا کیونکہ میرا کام یہاں ختم ہو چکا تھا، لیکن اس سے پہلے مجھے اس مہ جیس سے بھی معافی مانگنی تھی جس سے اپنی شناخت چھپانے کے جرم کا بوجھ اب مجھے کچلے جا رہا تھا، لیکن کوئی ایسا موقع یا بہانہ مجھے مل نہیں پایا کہ میں فضا تک اپنا پیغام پہنچا سکوں۔ رحیم نہ جانے کہاں چلا گیا تھا اور حویلی کے زیادہ تر فرائض اب نواز اور شمین کے کاندھوں پر آن پڑے تھے۔ اس رات کے واقعے کے بعد نواز اور حویلی کے باقی سبھی ملازمین کی نظروں میں حیرت کے ساتھ ساتھ میرے لیے ایک خاص احترام کی جھلک بھی واضح دکھائی دیتی تھی۔ جب سے انہیں یہ پتہ چلا تھا کہ میرا تعلق سارنگا کے اڈے سے ہے اور میں نواب صاحب کی حفاظت کی خاطر یہاں آیا تھا تب سے وہ میرا خصوصی خیال رکھنے لگے تھے۔ نواز دن میں تین چار بار سلام کرنے ضرور آتا تھا اور شمین نے تو جیسے میرے کمرے کی راہ ہی پکڑ لی تھی۔ ”آیاں میاں..... شمین کی نظر نے تو پہلے روز ہی بھانپ لیا تھا کہ آپ ضرور کسی خاص مقصد سے یہاں آئے ہیں..... آپ کی نگاہ کا تو میں پہلے دن سے معترف ہو گیا تھا جب آپ نے طائرانہ جائزہ لیا تھا زمرہ حویلی کا..... آپ جانتے ہیں کہ جب سے رحیم پکڑا گیا ہے چاروں طرف آپ کے نام کی دھوم ہے حویلی میں..... اور وہ کھڑوس نواز تو جیسے آپ کا مرید ہی ہو گیا ہے۔ کہتا ہے میں آیاں بھائی سے کچھ سیکھ کر ہی انہیں جانے دوں گا..... آخر آپ سارنگا کے اڈے کی شان جو ہو.....“ گویا اڈے کے ساتھ جڑی شہرت یا بدنامی نے حویلی میں بھی ڈیرہ جما لیا تھا۔ میں نے شمین ہی کے ذریعے فضا کو پیغام بھجووانے کی ٹھان لی، لیکن براہ راست ملنے کے بجائے احتیاطاً خانم کو وسیلہ بنانے کا سوچ کر میں نے کاغذ پر فضا کے لیے دو سطریں لکھیں کہ میں کل اس حویلی سے رخصت ہو رہا ہوں اور جانے سے پہلے اس سے ایک بار ملنا چاہتا ہوں۔ کاغذ کو لفافے میں ڈال کر میں نے شمین کے حوالے کیا کہ وہ اسے خانم کے ہاتھ میں دے آئے۔ میں جانتا تھا کہ خانم میرا پیغام فضا تک ضرور پہنچائیں گی۔ اب میرا فضا کے ساتھ ایسا کوئی تعلق نہیں رہ گیا تھا کہ میں زنان خانے میں اپنی مرضی سے جاسکتا۔ میری توقع کے مطابق خانم نے شمین کے ہاتھ ہی جو ابی پیغام بھجوادیا کہ آج شام کی چائے میں ان لوگوں کے ساتھ زنان خانے میں ہی بیٹوں۔

چار بجے مجھے لینے کے لیے خانم کی خاص نوکرانی آ گئی۔ زنان خانے کے در و دیوار پر ایک عجیب سا سکوت طاری تھا۔ فضا نہر کے قریب سنگ مرمر کی سلوں والی اپنی پسندیدہ جگہ پر موجود نہیں تھی۔ جانے اسے خانم نے میرے آنے کی اطلاع دی ہوگی یا نہیں.....؟ خانم مرکزی ہال کے دروازے پر میرا انتظار کر رہی تھیں۔ مجھے دیکھ کر وہ ہلکے سے مسکرائیں ”تم اپنے اندر حیرتوں کی اتنی زیادہ سوغات لیے، اتنے پرسکون کیسے رہ سکتے ہو..... جاؤ..... جا کر مل لو اس سے..... وہ اپنے کمرے میں ہی ہے..... میں چائے لگوا کر تم دونوں کو اطلاع کر دوں گی۔ نواب صاحب کو بھی میں نے زبردستی مدعو کر رکھا ہے آج کی چائے کے لیے..... ورنہ انہوں نے تو اپنے کمرے سے نکلنا ہی چھوڑ دیا ہے.....“ میں خانم کا شکریہ ادا کر کے خادمہ کی سربراہی میں آگے بڑھنے لگا تو انہوں نے پیچھے سے مجھے آواز دی۔



”آیان.....“ میں نے پلٹ کر نہیں دیکھا۔ ”میں تشکر کے دو بول بول کر تمہارے احسان کا رتبہ کم نہیں کروں گی..... بس اتنا کہنا چاہتی ہوں کہ زندگی کے کسی موڑ پر بھی یہ نہ بھولنا کہ اب ہم بھی تمہارے انہوں میں سے ہیں۔ بس ہمیں اپنا سمجھنا.....“

میں نے دھیرے سے مسکرا کر کہا ”یہ اعزاز مجھے ہمیشہ یاد رہے گا۔ آپ بے فکر رہیں“ خادمہ نے راہداری کے کونے میں آخری کھلے دروازے کے جانب اشارہ کیا اور خود واپس پلٹ گئی۔ کمرے کے اندر چاروں جانب کھلی کھڑکیوں سے باہر ڈھلتے سورج کی روشنی نے عجیب زردی مائل سا اجالا پھیلا رکھا تھا لیکن یہ پیلا ہٹ فضا کے چہرے پر پھیلی زردی سے بہت کم تھی۔ کمرے کے حلیف کتابوں سے بھرے ہوئے اور گل دانوں میں بھرے پھول مرجھائے ہوئے لگ رہے تھے۔ شاید بہت دنوں سے ان پھولوں کو تبدیل نہیں کیا گیا تھا۔ کمرے کی دیواروں پر ایران کے چند مشہور مصوروں کی بنائی ہوئی تصاویر لگی تھیں۔ ایک جانب پڑے ہوئے موسیقی کے جدید سسٹم (Audio system) کے قریب اردو اور فارسی کی غزلوں کی چند ڈسکس بھی نظر آ رہی تھیں۔ مجھے یاد آیا کہ فضا نے مجھے بتایا تھا کہ وہاں کی مشہور گلوکارہ گوگوش کو آج بھی ایران میں ایک دیوی کی حیثیت حاصل ہے، لیکن فضا اس وقت خود اسی اور ملال کی ایک ایسی دیوی کی طرح کھڑکی کے قریب کھڑی باہر دیکھ رہی تھی۔ جسے اس کا دیوتا ہمیشہ کے لیے سنیاں کی سوغات دے کر پھینچ گیا ہو۔

میری آہٹ پر اس نے چونک کر پلٹ کر دیکھا اور جلدی سے خود کو سنبھالا۔ آج اس نے سر پر اسکارف نہیں باندھا ہوا تھا۔ بس ایک سیاہ شال تھی جو بار بار اس کے سر سے سرک سرک جاتی تھی ”اوہ..... آپ آگے معاف کیجئے گا۔ میں اپنے دھیان میں تھی..... آئیے..... بیٹھے..... وہاں کیوں کھڑے ہیں.....؟“ میں ایک جانب کھڑکی کے سامنے بچھے صوفے پر بیٹھ گیا۔ یہاں آنے سے پہلے میں نے نہ جانے لفظوں کے کتنے انبار اپنے ذہن و دل میں جمع کر رکھے تھے، لیکن فضا کے سامنے آتے ہی جیسے میں اپنی یادداشت ہی کھو بیٹھا تھا۔ میں نے خود کو جمع کیا ”میں آپ سے کچھ کہنا چاہتا ہوں.....“ فضا سر جھکائے بیٹھی رہی ”جانتی ہوں لیکن اگر آپ اپنی شناخت چھپانے کے لیے کوئی معذرت کرنا چاہتے ہیں..... تو ایسا نہ کیجئے گا.....“ آپ نے اپنا فرض ہی تو پورا کیا ہے..... ہاں البتہ اگر آپ میرے اندر مچنے والی اٹھل پھٹل کے لیے خود کو ذمہ دار سمجھتے ہیں تو میں بس اتنا ہی کہوں گی کہ یہ میری تقدیر میں تھا..... آپ اپنے دل کو بوجھل نہ کریں.....“ فضا کی آواز لرز رہی تھی۔ وہ خود پر قابو پانے کی بھرپور کوشش کر رہی تھی لیکن اس کی آنکھیں اور آواز اس کا ساتھ نہیں دے رہی تھیں۔ ”میں جانتا ہوں میرا جرم بہت بڑا ہے..... لیکن مجھے اپنے منصب کے ظرف کی وسعت کا بھی خوب اندازہ ہے..... لہذا میں معذرت جیسے کم وزن لفظ استعمال کرنے نہیں آیا..... سچ یہی ہے کہ میرا تعلق زیر زمین دنیا کے ایک بدنام اڈے سے ہے اور یہی میری شناخت ہے۔“ فضا کچھ دیر خود کو سنبھالنے رکھنے کی جدوجہد میں جتی رہی اور پھر چانک ہی پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی ”کیوں آیان..... کیوں.....؟ کیوں کیا آپ نے میرے ساتھ ایسا.....؟ اگر آپ مجھے بتا بھی دیتے تو کیا میرے ظرف پر آپ کو اتنا بھی بھروسہ نہیں تھا کہ میں یہ راز سنبھال پاتی.....“ میں اس کے یوں ایک دم رو پڑنے سے بالکل حواس باختہ سا ہو گیا ”ارے ارے..... ایسے کیسے..... آپ اپنے قیمتی آنسو یوں تو نہ بہائیں..... چپ ہو جائیں..... مجھے بہت دکھ ہوگا اگر آپ ان موتیوں کو یوں ضائع کر دیں گی.....“ میرا دل چاہا کہ میں خود اپنی ہتھیلیوں میں اس خزانے کو جذب کر لوں۔ اس نے تڑپ کر میری جانب دیکھا ”اور مجھے جو دکھ ہوا ہے..... اس نقصان کی بھرپائی کیسے کریں گے

آپ.....؟“ مجھے اس کے اس معصوم سوال نے لاجواب کر دیا ”واقعی اس نقصان کا ازالہ تو ناممکن ہے۔ میں تو آپ کے ایک آنسو کی قیمت بھی عمر بھر ادا نہیں کر پاؤں گا..... آپ چاند نگر کی شہزادی ہیں اور میں ایک بے گھر بچارہ..... آوارہ..... مجھے اتنا قرض دار نہ کریں کہ میں خود کو بیچ کر بھی اسے ادا نہ کر سکوں۔“ فضہ نے اپنی زخمی نگاہ اٹھائی ”ایسا کیوں کہتے ہیں آپ..... آپ سے ان چند دنوں میں بہت کچھ سیکھا ہے میں نے..... مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ آپ کا تعلق کس گروہ یا قبیلے سے ہے۔ آپ وہ واحد انسان ہیں جن کی باتیں سن کر فرہاد کی یاد کی کک میرے دل سے مٹ جاتی ہے۔ مجھے آج تک لگتا تھا کہ زندگی کا بس ایک ہی زاویہ ہے جو فرہاد کے فلسفے نے میرے من کے اندر جا کر کیا ہے، لیکن آپ سے مل کر اور آپ کے زندگی کے بارے میں نظریات جان کر میں نے اپنے اندر ایک نئی فضا کو جنم لینے پایا تھا۔ مجھے بس یہی بات اندر سے کاٹے جارہی ہے کہ آپ جیسا فرد یہ دھری شناخت کیسے رکھ سکتا ہے؟..... میں آپ کی کس پہچان کو جتنی سمجھوں..... کسی انڈر ورلڈ مافیا سے جڑے ایک شخص کی یا پھر اس انسان کی جو مجھے چند دنوں میں بہت کچھ دے گیا..... کیا آج تک آپ نے مجھ سے جو بھی بانٹا وہ لفظ صرف ایک دکھاوا تھا؟ اپنے فرض سے بندھے ایک شخص کی مجبوری تھی.....؟“

”نہیں..... ایسا نہیں ہے..... ہاں میں اپنے فرض اور وعدے کے ہاتھوں مجبور ضرور تھا لیکن آپ سے مل کر تو میں نے خود اپنے اندر چھپے اک نئے آیان کو ڈھونڈا ہے..... آپ سے ملاقات کسی اڈے سے وابستہ شخص کی نہیں..... ایک نئے آیان کی تھی..... جسے اپنی کم مائیگی اور آپ کی بیش قیمت کا خوب احساس ہے۔“

فضہ نے اپنی جھکی پلکیں اٹھائیں۔ ”نہیں..... وہ آیان بھی بہت قیمتی ہے..... فضا سے کہیں زیادہ بیش قیمت ہے، اور ان تین چار دنوں میں اس آیان سے نہ مل کر مجھے احساس ہو رہا ہے جیسے وہ آیان میری زندگی کا جزو بنتا جا رہا ہے۔ میں سمجھتی تھی کہ فرہاد کے جانے کے بعد میرا دل اب کسی کے لیے یوں دھڑک نہیں پائے گا..... لیکن مجھے اعتراف کرنے دیں کہ اس رات لائبریری سے جب میں اپنی زخمی کلائی لے کر واپس لوٹی تھی تو شاید خود کو وہیں لائبریری کے دروازے پر ہی چھوڑ آئی تھی۔ شاید اسی رات کا یہ اثر ہے کہ میں اب تک کسی خواب کی کیفیت میں ہوں.....“ فضا رو پڑی..... ”آیان..... مجھے ڈر ہے کہ میں کہیں آپ کی محبت میں نہ مبتلا ہو جاؤں.....“



## باب 26

میں گھبرا کر اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ مجھ سے کچھ بولا نہیں گیا۔ میں اس بھولی اور معصوم لڑکی کو یہ بھی نہ کہہ سکا کہ ایسے راز دل کی چار دیواری میں ہی قید رہیں تو اچھا ہے۔ کیونکہ سن کی چوکھٹ پار کر جانے کے بعد یہ محترم باتیں بس ایک الزام بن کر رہ جاتی ہیں..... تہمت بن کر زبان در زبان پھیل جاتی ہیں، اور میں اس عفت آب کے کورے دامن پر ایک ہلکا سا دھبہ بھی برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ محبت جیسے الزام کا داغ تو بہت بڑی بات تھی۔ ”یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں..... ایسی غلطی نہ کیجئے گا۔ آپ جانتی ہیں کہ میں اڈے سے جڑا ایک بدنام ہوں..... جو کسی کی محبت کے قابل نہیں..... محبت کے لیے معاشرے میں کسی کی عزت و رتبہ ضروری ہوتے ہیں..... کسی مقام کی ضرورت ہوتی ہے..... میں تو وہ ہوں جس کو دیکھ کر لوگ اپنی چوکھٹ بند کر دیتے ہیں..... اپنی دلیز پر سیاہ لکیر پھیر دیتے ہیں تاکہ میرے سبز قدم اسے پار نہ کر جائیں.....“ بولتے بولتے میری آواز رو ہانسی ہو گئی اور شاید میری آنکھوں کا کوئی کمزور بندھ ٹوٹ گیا۔ وہ تڑپ کر اٹھی اور اس نے میری آنکھیں پونچھ ڈالیں ”آیان..... یہ کیا..... نہیں ایسا نہیں کرتے.....“ یہ سب کچھ اتنی تیزی سے ہوا کہ شاید خود فضا کو بھی اپنی اس بے اختیاری کا ادراک نہیں ہو سکا۔

باہر سے برتنوں کی آواز آئی اور پھر خاتم دو خادماؤں کے ساتھ چائے کی ٹرالی لیے کمرے میں آگئیں ”نواب صاحب بھی بیٹیں آرہے ہیں..... باہر بہت خنکی ہو گئی ہے“..... کچھ ہی دیر میں نواب بھی آگئے اور ہم سب نے فضا کے کمرے کی کھڑکی کے پاس ہی چائے پی۔ باہر ہلکی سی بوند باندی شروع ہو چکی تھی اور تیز سرد ہواؤں کے شور اور زور سے والان کے بلند و بالا درختوں کے پتے ٹوٹ کر فضا میں بکھرنے لگے تھے۔ میں انہی بکھرے پتوں پر چلتا ہوا شام ڈھلے مردان خانے میں واپس پہنچا تو میرا چہرہ بھیگا ہوا تھا۔ لوگوں کے لیے وہ باہر بہتی بارش کا پانی تھا جس نے میرے گال بھگو دیے تھے اچھا ہی ہے کہ قدرت نے بارش کے پانی یا آنسوؤں میں سے کسی ایک کا رنگ جدا تخلیق نہیں کیا تھا ورنہ شاید میرے لیے جواب دینا مشکل ہو جاتا۔ کاش سبھی رونے والوں کے سروں پر کوئی بادل آ کر برس جایا کرتا تو ہم میں سے بہتوں کا بھرم باقی رہ جاتا۔ میں نے کمرے میں پڑے تو لیے سے اپنا چہرہ پونچھ لیا۔ ہر آنسو کی قسمت میں کسی نازنین کی تھیلی کا گداز نہیں ہوا کرتا۔

رات گئے میرے اندر کی ہل چل نے بخار کی صورت اختیار کر لی اور صبح تک میرا جسم شدید تپ سے پھٹکنے لگا۔ شہین نے میرے ماتھے پر ہاتھ رکھا تو گھبرا کر واپس دوڑا اور پھر نواب صاحب اور ڈاکٹر سمیت ہی واپس لوٹا۔ میں نے بڑی مشکل سے ان سب کو یقین دلایا کہ شاید رات کو سردی لگ گئی ہو..... لیکن اب میں بالکل ٹھیک ہوں، لیکن ڈاکٹر کب بھلا مریض کی سنتے ہیں۔ سو اس ڈاکٹر نے بھی مٹھی بھر کڑوی گولیاں اور چند سیرپ میرے حلق سے نیچے انڈیل دیے۔ مجھے بچپن سے ہی ان کڑوی داوؤں اور گولیوں سے شدید چڑھتی، لیکن جب انسان کا نصیب ہی کڑوا ہو تو پھر ان دنیاوی کڑواہٹوں سے کیا لگہ.....؟

اپنے پروگرام کے مطابق مجھے آج شام زمر دھولی سے رخصت ہو جانا چاہئے تھا مگر اس بخار نے مجھے شام ڈھلے تک بے سدھ کیے رکھا اور پھر



شام کو نواب صاحب نے باقاعدہ حکم صادر کر دیا کہ طبیعت سنبھلنے تک میں واپسی کی سوچ بھی دل سے نکال دوں۔ میں موسیٰ کو واپسی کا پیغام بھجوا چکا تھا اور اگلے روز میں بستر پر پڑا اسی شش و پنج میں مبتلا تھا کہ یعقوب مینشن میں بھی میرا انتظار کرتے ہوں گے۔ سہ پہر بارہ بجے کا وقت تھا جب اچانک ہی حویلی کے پورچ میں چند گاڑیوں کے رکنے اور پھر زور زور سے باتیں کرنے کی آواز سنائی دی، اور پھر سب سے پہلے نواب صاحب میرے کمرے میں داخل ہوئے۔

”لو بھئی..... تمہیں بہت فکر تھی نا اپنے انتظار کرنے والوں کی..... تو تمہارا انتظار بھی ختم ہوا.....“ اور پھر نواب صاحب کے عقب میں سب سے پہلے مجھے موسیٰ کی جھلک نظر آئی۔ میں حیرت اور خوشی سے اٹھ کر بیٹھائی تھا کہ اس کے پیچھے اسماعیل اور پھر خود سارنگا بھی مجھے کمرے میں داخل ہوتے نظر آئے۔ میں موسیٰ سے گلے مل کر ہٹا تو رنگا نے بھیج کر مجھے سینے سے لگا لیا۔ ”کہاں رہ گیا تھا تو سا جن..... تو نے تو سب کو اداس ہی کر ڈالا.....“ موسیٰ نے مجھے جھکی دی ”رنگا بھائی..... ہمارے شہزادے نے ہماری لاج رکھ لی..... جس کام کے لیے یہاں آیا..... وہ اس نے کر دکھایا.....“ سارنگا نے ہنس کر موسیٰ سے کہا ”ہاں رے..... آخر شاگرد کس کا ہے..... یہی کہلوانا چاہتا تھا نا تو میری زبان سے.....“ سب ہنس پڑے۔ میں اب تک حیران تھا ”لیکن آپ سب لوگ..... اچانک یہاں..... کیسے.....“

”بس تیرے بغیر دل نہیں لگا تو ہم تجھے لینے چلے آئے۔ نواب صاحب نے تیری بیماری کی اطلاع پہنچادی تھی..... ابھی کوئی اور بھی ہے جس کا دل تیرے بنا نہیں لگتا..... اس کی سواری بھی بس آتی ہی ہوگی.....“ میں نے چونک کر سارنگا کو دیکھا، اور کون مجھ سے ملنے یہاں تک آسکتا تھا بھلا.....؟؟ اور پھر پورچ میں کسی تیسری گاڑی کے رکنے کی آواز سنائی دی اور چند لمحوں میں جو چہرہ دروازے پر نمودار ہوا اس نے مجھے حیرت اور خوشی کا ایک مزید جھٹکا دیا۔ وہ ناہید تھی ”آیان بھائی..... آپ یہاں چھپے بیٹھے ہیں..... لیکن دیکھ لیں..... آپ کی بہن نے آخر آپ کو ڈھونڈ نکالا.....“

”ارے بلی..... تم بھی یہیں موجود ہو..... سچ ہے بلیوں سے چھپنا بڑا مشکل کام ہے.....“ ناہید کچھ روہا سی ہی ہو گئی ”پورا ایک مہینہ ہو گیا ہے آپ کو گئے ہوئے..... کوئی ایسا کرتا ہے اپنی بہنوں کے ساتھ.....“ خود میری آنکھیں بھی نم ہونے لگی تھیں اب میں اسے کیا بتاتا کہ میں ایسے کتنے قیمتی رشتے پیچھے چھوڑ آیا تھا۔ سارنگا نے اسے شانے سے پکڑ کر بھیج لیا ”چل ری..... اب تو مل گیا نا تجھے میرا بھائی..... اب کا ہے کو اپنی جان ہلکان کرتی ہے.....“ میں نے ناہید کے سامنے کان پکڑے ”چلو..... اب کی بار معاف کر دو..... پھر کبھی ایسا ہوا تو جو چور کی سزا وہ تمہارے بھیا کی.....“ ناہید ہنس پڑی۔ نواب صاحب نے سارنگا کی لاکھ منتوں کے باوجود انہیں اسی روز واپسی سے روک لیا۔ ایک بہانہ میری بیماری بھی تھی اور دوسرا یہ کہ سارنگا پہلی مرتبہ زمرہ حویلی میں آیا تھا۔ اس لیے نواب صاحب کی مہمان داری کا مزہ چکھے بنا اسے بھلا کون یہاں سے جانے دیتا۔

دو پہر کے کھانے پر نواب صاحب نے خصوصی طور پر خانم اور فضا کو بھی مردانے میں مدعو کیا ہوا تھا۔ خانم حیرت سے اس دوسری دنیا کے لوگوں کو دیکھتی رہیں اور فضا اور ناہید آپس میں نہ جانے کیا سرگوشیاں کرتی رہیں۔ شاید دنیا کی ہر عورت عالم ارواح سے ہی دوسری عورت کی سبیلی ہوتی ہے۔ شرط صرف دنیا میں ملاقات کی ہے۔ خانم نے بھی ناہید کو ڈھیر سارا پیار کیا اور اسے بتایا کہ اس کا بھیا آیان اب ان کا بیٹا بھی ہے لہذا اس ناٹے سے اب وہ ناہید کی ماں ہوئیں۔ ناہید تو پہلے ہی اتنے سارے نئے رشتے دیکھ کر خوشی سے بے حال ہوئی جا رہی تھی۔ کھانے کے بعد عورتیں زنان خانے کی جانب چلی گئیں۔

ہم سب مرکزی ہال میں آکر بیٹھ گئے اور ایرانی سبز قبوے کے کئی دور چلتے رہے۔ رنگا کو اس قبوے کا ذائقہ بہت بھلا محسوس ہوا اور اس نے نواب صاحب سے یہ چائے ایران سے منگوانے کی فرمائش بھی کر دی۔ نواب صاحب نے رنگا کو بتایا کہ حویلی کے گوداموں میں چائے کی وافر مقدار موجود ہے جو کل صبح ہی یعقوب مینشن منتقل کر دی جائے گی۔ یونہی ادھر ادھر کی باتیں چلتی رہیں لیکن سارنگا نے رحیم منجر کا موضوع چھیڑنے سے جان بوجھ کر احتراز کیا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اس موضوع سے نواب صاحب کے بہت سے دبے درد پھر سے ابھر آئیں گے۔ وہ نواب خاتون کی اس ناگہانی موت کے صدمے سے ابھی تک باہر نہیں نکل پائے تھے۔ عصر کے بعد ہم سب چہل قدمی کرتے ہوئے باہر دالان میں نہروالی طرف نکل آئے اور دشمن نے جھٹ پٹ دیں ہم سب کے لیے کرسیاں ڈلوادیں۔ چھتری کی ضرورت تو یوں بھی نہیں تھی کیونکہ دھوپ کی نرم گرمابٹ بھلی لگ رہی تھی۔ نواب صاحب نے چپکے سے پاشا کوند جانے کیا اشارہ کیا کہ وہ غیر محسوس طریقے سے کچھ دیر کے لیے محفل سے غائب ہو گئے، اور پھر واپس لوٹے تو درمیانے سائز سے ذریعہ ابریف کیس ان کے ہاتھ میں تھا۔ جسے انہوں نے نواب صاحب کے کہنے پر ایک طرف رکھ دیا۔ نواب دبیر نے اپنے لفظ جوڑے۔

”سارنگا بھائی..... میں جانتا ہوں کہ آپ کے کسی ایک احسان کی قیمت بھی میں اپنی ساری زندگی لٹا کر بھی ادا نہیں کر پاؤں گا..... لیکن اگر آپ برائے نامیں تو یہ کچھ.....“

رنگا نے ہاتھ اٹھا کر نواب صاحب کی بات کاٹ دی۔ ”بڑے صاحب..... مارنا ہے تو جوتے سے مار لو..... لیکن یہ نوٹوں کا تھنر رنگا کوند مارو..... بولو تو ہم ابھی یہاں سے اٹھ جاتے ہیں..... کیا آپ نے رنگا کو بس اتنا ہی سمجھا ہے.....“

نواب صاحب گھبرا گئے ”نہیں نہیں..... خدا نخواستہ میری ایسی مجال کہاں..... میں جانتا ہوں کہ یہ کاغذ کے چند ٹکڑے آپ کے لیے کتنے حقیر ہوں گے..... لیکن دنیا کی ایک ریت بھی تو ہے نا.....“

”دنیا کی ساری ریتی اور سب رواج ہم نے آپ کی حویلی پر حاضری دے کر اور یہاں آپ کا نمک کھا کر پورے کر دیے ہیں..... ہاں اگر آپ کو اب بھی کوئی شک ہے تو اس بنجان سے پوچھ لیتے ہیں.....“ سارنگا نے میری جانب دیکھا ”کیوں رے..... کیا تجھے چاہیے یہ بکسا؟..... کیا تو اسی کے لیے یہاں آیا تھا“ میں گڑبڑا سا گیا ”مجھے..... نہیں تو..... میں بھلا کیا کروں گا اس کا؟.....“ ”موٹی اور سارنگا دونوں ہی میری اس بوکھلاہٹ پر ہنس پڑے۔

”دیکھا بڑے صاحب..... ہمارا سورا بھی یہ نہیں چاہتا..... آپ ایسا کرو کہ اسے اپنی گڑبٹیا کے سر سے وار کر صدقہ نیاز دے دو..... تاکہ حویلی پر آتی بلائیں بھی ہمیشہ کے لیے ٹل جائیں.....“

نواب صاحب کی آواز میں مومنیت تھی۔ ”میں جانتا ہوں کہ میرا پالا کمال ظرف والوں سے پڑا ہے۔ میری گستاخی کو میری نادانی سمجھ کر معاف کر دیجئے گا.....“ بات آئی گئی ہو گئی اور نواب صاحب نے دوبارہ کسی معاوضے کی بات نہیں چھیڑی۔ رات کا کھانا مردانے اور زنانے میں الگ الگ چنا گیا البتہ کھانے کے بعد قبوے کے دور سے پہلے خانم، فضا اور ناہید سمیت کچھ دیر کے لیے مردانے آئیں اور کچھ دیر بیٹھ کر پلٹ گئیں۔ فضا شاید مجھ سے کچھ بات کرنا چاہتی تھی لیکن ایسا کوئی موقع ہی نہیں مل سکا۔ مجھے بخار کی تھکن نے پھر سے ستانا شروع کر دیا تھا جب کہ سارنگا، موٹی

اور نواب صاحب کا ابھی مزید محفل جمانے کا ارادہ تھا۔ میں ان سب سے اجازت لے کر اپنے کمرے میں چلا آیا۔ میرے ذہن میں بار بار اسی ناز آفریں کے آنسو اور باتیں کسی جھماکے کی طرح لپک جاتے تھے۔

میں آدھی رات تک بستر پر بڑا کروٹیں لیتا رہا۔ یہ محبت ہمیشہ انہی دلوں پر ڈاکہ کیوں مارتی ہے جہاں اگلے کے نصیب میں مقدر کی صرف خالی تجویریاں ہی منہ چڑاتی ملتی ہیں۔ اسے یہ خوف تھا کہ کہیں اسے مجھ سے محبت نہ ہو جائے کتنی نادان تھی وہ جو یہ بھی نہیں جانتی کہ محبت ہمیشہ اپنے خوف سے پہلے دلوں میں ڈیرے ڈالتی ہے۔ یہاں کبھی کسی کا مکمل جہاں نہیں ملتا۔ محبت کوئی جوئے کی بازی تو نہیں کہ ہر بازی کے بعد محبت کا جواری بھی یہی کہتا پھرے کہ چلو ”ایک محبت اور سہمی.....“ یہ تو وہ بازی ہے جو ہر بار آخری بازی ہوتی ہے۔ جو اہوتا تو ایک بازی اور سہمی کا کلیہ ہمیں ہر بار نیا داؤ کھیلنے پر مجبور کیے رکھتا اور شاید ہم کبھی نہ کبھی اپنے من کی مراد کو جیت ہی لاتے، لیکن یہاں کے قواعد ہی جدا تھے۔ دفعہ مجھے ایک اور عجیب سا احساس بھی ہوا۔ فضلہ نے مجھے بتایا تھا کہ اس نے فرہاد کے سامنے کبھی اپنے جذبوں کا اظہار نہیں کیا تھا لیکن اگر وہ محبت ہی تھی تو پھر یہ کلیہ فضلہ کی محبت پر کیوں لاگو نہیں ہوا..... شاید دنیا کی ہر نئی محبت اپنی جگہ آپ بناتی ہے۔ کوئی بھی نئی محبت پچھلی محبت کے اثرات کو نہیں مٹا سکتی نہ ہی اس کی جگہ لے سکتی ہے۔ شاید محبت کی مثال بھی بستے پانی جیسی ہے جو ہر بار اپنا راستہ خود بناتا ہے، تو پھر میرے دل کی راہیں گہنا کے ساتھ ہی کیوں بند ہو گئی تھیں۔ اس کی ہر پگھلاؤ پر خاردار جھاڑیوں اور جنگلی گھاس کیوں آگ آئی تھی جس نے بھی راستے اور ساری منزلوں کے نشان مٹا ڈالے تھے..... صبح تک میرا بخارا تر گیا لیکن نواب صاحب نے ہمیں دوپہر کے کھانے کے بعد ہی روانگی کی اجازت دی، لیکن قدرت ہمارے لیے کب واپسی کے راستے آسان اور کھلے چھوڑ کر رکھتی ہے۔ ہر قدم پر ایک نئی گھات، ایک نئی بیڑی ہمارے قدم روکنے کے لیے موجود ہوتی ہے۔

عصر کے وقت جب ہم حتمی طور پر نواب صاحب سے رخصت ہونے کے لیے مرکزی دالان میں جمع تھے تو ماحول اداس تھا۔ خانم نے ناہید اور مجھ سے ہزار وعدے لیے کہ اب ہم زمر دھوپیلی کی راہ نہیں بھلائیں گے اور آتے جاتے رہیں گے۔ فضلہ صبح سے ہی کچھ خاموش سی تھی۔ میں نے اسے ماحول میں واپس لانے کے لیے ٹوکا ”اور ہاں یاد رہے..... ابھی ہم دونوں پوری طرح اس بات پر متفق نہیں ہوئے کہ منغل آرکی ٹیچر زیادہ بہتر ہے یا پھر ان کی اس دور کی مصوری..... یہ مدعا ابھی باقی ہے.....“ فضلہ دھیرے سے مسکائی ”ابھی بہت سے دوسرے مدعے بھی ادھورے تھے جنہیں چھوڑ کر آپ جارہے ہیں.....“ میں نے غور سے اس کی آنکھوں میں دیکھا اور ابھی کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ دھوپیلی کے مرکزی دروازے کی جانب سے ایک کڑک دار اور بھاری آواز ابھری ”ایسی بھی کیا جلدی ہے رنگا بھائی..... ہم سے ملے بیٹائی چلے جاؤ گے کیا.....؟.....“ سب نے چونک کر پلٹ کر دروازے کی جانب دیکھا۔ موسیٰ کی زبان سے سرسراہٹ سی سرگوشی نکلی۔

”یہ تو کالی ہے..... یہ یہاں کیا کر رہا ہے.....؟“





## باب 27

میں نے آج تک کالی دادا کا صرف نام ہی سنا تھا، اور یہ جانتا تھا کہ زیر زمین تقسیم کے اصول کے مطابق زمرہ حویلی کا علاقہ کالی کے حصے میں ہی آتا ہے، لیکن وہ اس طرح اور اچانک یہاں حویلی تک کیسے پہنچ گیا۔ یہ معمر ابھی تک حل طلب تھا۔ ہم سبھی دم بخود کھڑے تھے۔ کالی نے حویلی کے دروازے کو دھکیلا اور اس کے عقب میں ہمیں اس کے دوساتھی اور دو رکھڑی جیپ بھی نظر آئی۔ رنگا نے بنا کسی مرعوبیت سے کہا ”تیری بن بلائے آنے جانے کی عادت نہ گئی کالی..... یہ شریفوں کا گھر ہے..... یہاں منہ اٹھا کر اندر آنا منع ہے.....“

کالی نے طنز یہ لہجے میں جواب دیا ”واہ استاد..... شرافت کی بھی تم نے خوب کہی..... اگر یہ شریفوں کی جگہ ہے تو پھر رنگا اور موسیٰ یہاں کیا کر رہے ہیں.....؟ سنا ہے تیرا کوئی نیا سورا بھی نہیں ہے اسی حویلی میں“ کالی کی نظریں سب پر سے پھسلتی ہوئی مجھ پر آکر ٹک گئیں ”اچھا تو یہ ہے تیرا نیا ہتھیار.....“ انو بھائی..... بڑا بانکا سپاہی ڈھونڈا ہے استاد“ سارنگا نے خواتین کی موجودگی کا لحاظ کرتے ہوئے اپنی آواز کو بڑی مشکل سے دھیمہ رکھا ”کام کی بات کر کالی..... اپنے پاس زیادہ وقت نہیں ہے.....؟“

کالی مسکرایا ”پراپنے پاس تو وقت ہی وقت ہے استاد..... تم چلے جاؤ..... ویسے بھی اپنا کام نواب صاحب کے ساتھ ہے..... کچھ لمبی باتیں کرنی ہیں ان کے ساتھ.....“

اب نواب صاحب کے غصے میں آنے کی باری تھی ”لیکن میں تمہیں نہیں جانتا..... تمہیں اندر آنے کی اجازت کس نے دی.....؟.....“

”میں خود نہیں آیا نواب صاحب..... آپ کے بڑے بیٹے نے نیوٹا بھیجا تھا مجھے بلانے کے لیے.....“ ہجوم میں سے وقار دو قدم آگے بڑھ آیا ”انہیں میں نے بلایا ہے ابا جان.....“ نواب صاحب گنگ سے رہ گئے ”لیکن کیوں.....؟.....“ وقار کی جگہ کالی نے جواب دیا ”میں بتاتا ہوں..... آپ کا صاحبزادہ اپنا حق چاہتا ہے جو آپ اسے دے نہیں رہے..... اسی لیے اسے ہماری مدد کی ضرورت پڑی ہے اور کالی کی سرکار نے تو ہمیشہ حق داروں کو ان کا حق دلایا ہے۔ لہذا اب حویلی اور جائیداد کا بٹوارہ کرنی دو تو بہتر ہے نواب صاحب.....“

حویلی کی خواتین اور ملازموں کی جانب سے دہلی دہلی سرگوشیاں ابھریں۔ معاملہ اتنا سیدھا نہیں تھا جتنا نظر آ رہا تھا۔ سارنگا کے اشارے پر نواب صاحب نے ناہید سمیت دیگر خواتین کو واپس زنانے میں جانے کا کہہ دیا۔ کچھ ہی دیر میں یہ عقدہ بھی کھل گیا کہ وقار نے اپنے اوباش دوست رئیس کے مشورے پر کالی کو اپنے حصے اور جائیداد کے بٹوارے کے لیے طلب کیا تھا۔ نواب خاتون کی وصیت اور موت بھی اس ناخلف اولاد پر کوئی اثر نہیں کر سکتی تھی۔ نواب صاحب سر پکڑے بیٹھے تھے اور پاشا صاحب انہیں تسلیاں دے رہے تھے۔ کچھ دیر میں رئیس بھی وہیں بھٹکتا نظر آیا۔

رنگا نے کالی کو مخاطب کیا ”دیکھ کالی..... یہ باپ بیٹے کا جھگڑا ہے..... اس میں تو اپنی ٹانگ نہ ہی اڑا تو بہتر ہے.....“ کالی نے وقار کے کاندھے پر ہاتھ رکھا ”نہ رنگا استاد نہ..... ابھی تو میں نے تجھ سے یہ بھی نہیں پوچھا کہ میرے علاقے کے کسی گھریلو جھگڑے میں تیرا یہ بانکا کہاں سے

جگ پڑا۔؟..... ابھی تو تیری پٹنی اپنی کابینہ کے سامنے ہونی باقی ہے..... اور تو جانتا ہے کہ کالی کے قدم ایک بار جس چوکھٹ کو پار کر جائیں..... وہاں کا قصہ بننا کر ہی پلٹتے ہیں..... نواب صاحب بڑا رہ کر دیں تو کالی اپنا حصہ لے کر ابھی پلٹ جائے گا.....“

رنگا کا پارہ چڑھ گیا..... ”کتنے میں سودا کیا ہے تجھ سے اس نواب زادے نے..... گدھ آخر گدھ ہی ہوتا ہے کالی..... حرام اور مردار خوری سے باز نہیں آتا.....“

نواب صاحب کی پریشانی بڑھتی جا رہی تھی ”تم سے وقار نے جتنے کا وعدہ کیا ہے وہ میں تمہیں یونہی دینے کو تیار ہوں..... میں نہیں چاہتا کہ حویلی کے جھگڑے باہر پکھری اور عدالتوں میں طے ہوں..... تم اپنا معاوضہ لو اور واپس لوٹ جاؤ.....“

کالی نے زہر خندانہ انداز میں نواب کو دیکھا ”ایسے کیسے واپس لوٹ جاؤں نواب صاحب..... اپنے دھندے کا اصول ہے کہ کام لے لو تو پورا کر کے ہی جاؤ..... ہاں اگر رسوائی کا ایسا ہی خوف ہے تو ٹھیک ہے ایک سودا کر لیتے ہیں۔ آپ یہ زمر و حویلی نواب زادے کے نام کرو اور رنگا استاد سے کہو کہ وہ اپنا علاقہ میرے حق میں خالی کر جائے..... پھر کچھ بات بن سکتی ہے..... بولو..... منظور ہے یہ سودا.....؟“

کالی کی بات سن کر ماحول پر ایک سناٹا طاری ہو گیا۔ رنگا نے کالی پر طنز کیا ”واہ رے کالی..... تل سے علاقہ نہ حاصل کر سکا تو اب جھل پر اتر آیا..... پھر بھی خود کو استاد کہتا ہے..... تف ہے تیری مردانگی پر.....“

کالی مسکرایا ”استاد وہی ہوتا ہے جو ٹھیک وقت پر ٹھیک ہتھیار استعمال کرنا جانتا ہو..... جھل کے وقت جھل اور تل کے وقت تل..... ہر جگہ طاقت ہی کام نہیں آتی رنگا استاد..... میں تو کہتا ہوں تو بھی کچھ وقت میری صحبت میں گزار لے..... فائدہ ہوگا“ دفعۃً نواب کی آواز ابھری ”حویلی کا بڑا رہ ہو بھی گیا تو یہ دو بھائیوں میں تقسیم ہوگی۔ ان کی سوتیلی بہن اور ماں پہلے ہی اپنے حصے سے دست بردار ہو چکی ہیں۔ اگر دونوں بھائی اس تقسیم کے لیے تیار ہیں تو ٹھیک ہے..... یہ کام بھی ہو جائے گا.....“ چھوٹا بیٹا سجاد اپنی جگہ پر ساکت کھڑا تھا۔ کہتے ہیں کہ شر میں سے بھی کبھی خیر کا پہلو نکل آتا ہے، اور اس وقت یہ بات سچ ثابت ہوتی نظر آرہی تھی۔ سجاد نے مجبور باپ کے ساتھ کاندھا ملا یا اور تن کر بولا ”مجھے کچھ نہیں چاہئے..... یہ فیصلہ ابا جان کا ہوگا کہ وہ حویلی کا کیا انجام چاہتے ہیں۔ میں ہر صورت ابا جان کے ساتھ ہوں.....“ نواب کی آنکھیں بھرا آئیں۔ اس نے سجاد کے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا ”کاش..... میرے دونوں بازو آج میرے ساتھ ہوتے..... جیتے رہو سجاد بیٹا.....“ کالی نے زور سے ایک تالی بجائی ”چلو جی..... یہ مسئلہ تو حل ہوا۔ چلو نواب صاحب..... اب جلدی سے اسٹامپ پیپر اور قلم منگو کر اس قصے کو ختم کرو..... میں اپنا حساب بعد میں نواب زادے سے خود کر لوں گا.....“

نواب صاحب نے لمبی سی سانس بھری اور پاشا صاحب کو کچھ کہنے کے لیے مڑے..... لیکن ان کے کچھ کہنے سے پہلے ہی رنگا کی کڑک دار آواز گونجی..... ”نمبر جا کالی بادشاہ ایسی بھی کیا جلدی ہے..... ابھی کچھ دیر پہلے تو تجھے میرا علاقہ بھی بھیک میں چاہئے تھا، اتنی جلد صرف حویلی پر ہی راضی ہو گیا.....؟ ایک سودا تو نے پھینکا تھا۔ اب ایک سودا رنگا کا بھی سن لے..... یہ حویلی اور میرا علاقہ چاہئے تو فیصلہ چاقو کے تل پر ہوگا..... تو مجھ سے بچ گیا تو میرا سا علاقہ اور یہ حویلی تیرے نام ہو جائے گی اور اگر بازی میرے نام رہی تو پھر تجھ سے تیرا علاقہ تو جائے گا ہی..... ساتھ میں ہمیشہ کے لیے در بدر بھی ہو جائے گا..... بول منظور ہے رنگا کا یہ سودا.....“

زیر زمین دنیا کے اصول کے مطابق کالی کے پاس اس لٹکار کے جواب میں سوائے ہاں کرنے کے اور کوئی چارہ بھی نہیں تھا کیونکہ اس کے بہت سے کارندوں کے سامنے رنگا نے اسے چیلنج کیا تھا اور یہ بات اب چھپنے والی نہیں تھی۔ رنگا نے بہت بڑا جوا کھیلنے کا فیصلہ کیا تھا کیونکہ چاقو پر گرفت کے معاملے میں کالی بھی رنگا سے بس انہیں بیس ہی تھا اور کون جانے کہ اس نے خود رنگا کو اکسانے کے لیے یہ سارا کھیل کھیلادیا ہو، کیونکہ ان کی دنیا کے قانون کے مطابق ایک بار جب کوئی علاقہ کسی کے نام ہو جائے تو ہارنے والا حریف کم از کم دو سال تک دوبارہ اسے حاصل کرنے کی کوشش نہیں کر سکتا تھا جب تک کہ دوسرا فریق خود اسے چیلنج نہ کر دے۔ رنگا کو کالی سے وہ علاقہ چھینے ابھی صرف چھ ماہ ہی ہوئے تھے اور شاید کالی اس ہزیمت کو بھلا نہیں پایا تھا اور کسی ایسے ہی موقع کی تلاش میں تھا جب رنگا زچ ہو کر خود کالی کے مقابل آجائے۔ اگر زمر دھوبلی کا قصہ درمیان میں نہ آتا تو شاید کالی کا یہ خواب کبھی پورا نہ ہوتا، لیکن قدرت نے وقار کی نافرمانی کی صورت میں اسے یہ موقع جلد فراہم کر دیا۔ اچانک میری نظر اس سازش کے مرکزی کردار رئیس کے چہرے پر پڑی، اور اس کے چہرے پر پھیلی مسکراہٹ اور کالی کے ساتھ ہوتے اشاروں نے مجھے یہ بھی باور کرا دیا کہ رئیس کو کسی سوچے سمجھے منصوبے کے تحت ہی نواب کے بڑے بیٹے پر دوستی کا جال پھینکنے کے لیے تیار کیا گیا تھا۔ مطلب کالی کی نظر شروع سے ہی زمر دھوبلی پر تھی جب میرے اور رنگا کے قدم بھی یہاں نہیں پڑے تھے۔ اس وقت کوئی نہیں جانتا تھا کہ معاملہ آگے چل کر یہ کروٹ لے لے گا۔ اب جانے یہ ان کی بد قسمتی تھی یا خوش قسمتی کہ سارا رنگا بھی اس معاملے میں ملوث ہو گیا تھا۔ کالی کے چہرے پر ایک آسودہ سی مسکراہٹ ابھری جیسے اسے اپنا مقصد مل جاتا نظر آ رہا ہو۔

”ٹھیک ہے رنگا استاد..... جیسے تمہاری مرضی..... آج ہی یہ خبر نیچے کے سب بڑوں تک پہنچ جائے گی..... تم دگل کی تاریخ اور جگہ طے کر لو.....“ رنگا نے سکون سے جواب دیا ”تاریخ میں دیتا ہوں..... آج ہفتہ ہے..... اگلے ہفتے کے روز اسی وقت، جگہ بھی تمہاری اور علاقہ بھی تمہارا..... جا..... جا کر اپنی بربادی کی تیاری کر لے.....“

نواب صاحب پریشانی سے یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے۔ ان کی آواز میں سراسیمگی تھی ”رنگا بھائی آپ کو یہ سب کچھ کرنے کی ضرورت نہیں ہے..... آپ کے اس حویلی پر پہلے ہی کئی احسان ہیں اور میں خود یہ حویلی وقار کے نام کرنا چاہتا ہوں..... اب تو سجاد بھی اپنے حق سے دست بردار ہو گیا ہے..... کوئی الجھن باقی نہیں رہی..... پھر آپ یہ سب کیوں.....“

رنگا نے نواب کی بات کاٹ دی ”ہمارے سامنے کوئی مردار خور آپ کی حویلی چھین کر لے جائے..... ایسا کیسے نواب صاحب..... اور پھر بعد میں وہ نواب زادے کے پاس ہی رہے گی اس کا آپ کو کیا پتہ؟.....؟“ اس کے اتنے جھجھجھے ہوئے گے کہ خود آپ کے بیٹے کے ہاتھ میں صرف وراثت کا کاغذ رہ جائے گا..... اب جو ہوگا، سو دیکھا جائے گا.....“ کالی اور وقار دونوں واپس جا چکے تھے۔ رنگا نے بھی پریشانی میں گھر سے نواب سے رخصت چاہی اور اسے تسلی دے کر ہم ناہید کو لے کر شہر لوٹ آئے۔ ناہید کے چہرے کا رنگ بھی اڑا ہوا تھا اور اس کی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ وہ روتی رہی ہے۔ موسیٰ اور سارا رنگا یعقوب میٹشن جا چکے تھے۔ میں اسماعیل کے ساتھ ناہید کو گھرا تارنے کے بعد واپسی کے لیے پلٹنا ناہید نے آواز دے کر مجھے روک لیا ”آیاں بھیا.....“ میں جاتے جاتے رکا..... ”ہاں بولو.....؟“

ناہید کسی کش مکش کا شکار تھی ”آپ بابا کو یہ سب کرنے سے روک کیوں نہیں دیتے..... میرا دل اندر سے کانپ رہا ہے.....“ اس کی آواز روہانسی ہو گئی۔ ”ارے ارے..... یہ کیا.....؟ اتنے بہادر باپ کی بیٹیوں پریشان ہو رہی ہے..... کوئی دیکھے گا تو کیا کہے گا.....“ ناہید رو پڑی ”یہ



خوف آج کا نہیں ہے بھائی..... بچپن سے میں دن میں اس خوف اور ان وسوسوں کے ہاتھ سوسو بار مرتی آئی ہوں اگر بابا کو کچھ ہو گیا تو میں جیتے جی زندہ درگور ہو جاؤں گی۔ میں اپنا ایک بھائی پہلے ہی کھو چکی ہوں۔ اب کوئی اور نقصان سہہ نہیں سکتی۔ میری آپ سے بھی یہی التجا ہے کہ اس اندھیری دنیا کو چھوڑ دیں۔ جس کا اندھیرا انسان کا ہر رشتہ نگل جاتا ہے۔ میں آپ دونوں کے ہاتھ جوڑتی ہوں..... میری یہ التجا مان لیں“ ناہید واقعی ہاتھ جوڑ کر میرے سامنے کھڑی ہو گئی۔ میں نے جلدی سے اس کے بندھے ہاتھ کھول دیے“ ہمیں ہاتھ نہیں جوڑتیں..... بس حکم دیا کرتی ہیں..... میں اور تمہارے بابا..... شاید ہم دونوں ہی اپنی مرضی سے اس دنیا کا حصہ نہیں بنے..... ہمیں ہماری دنیا نے دھکیل کر ان اندھیروں کا حصہ بنایا ہے..... لیکن اتنا یقین رکھو کہ تمہارے بابا اس کالی دنیا کا حصہ ہوتے ہوئے بھی اندر سے بہت اچلے ہیں..... اپنے اوپر جھوٹ کی سفیدی کا ملمع چڑھائے ہوئے ظاہری دنیا کے ان منافقوں سے کہیں زیادہ سچے ہیں.....“

”میں جانتی ہوں..... اسی لیے تو زیادہ ڈرتی ہوں کہ ان کی دنیا میں ان جیسے طرف والے بہت کم ہیں اور اگر کسی کم ظرف نے انہیں کوئی نقصان پہنچا دیا تو میں جی نہیں پاؤں گی۔ وہ آپ کی بہت سنتے ہیں۔ آپ مجھ سے وعدہ کریں کہ آپ ان سے بات ضرور کریں گے.....“

”ٹھیک ہے..... وعدہ کرتا ہوں..... اور یہ وعدہ بھی کرتا ہوں کہ جب تک میں ان کے آس پاس ہوں کسی بھی خطرے کو مجھ سے ہو کر ان تک پہنچنا ہوگا۔ چلو اب تم یہ اداسی پیر بیٹھ کر دو..... اور مجھے ہنستے ہوئے رخصت کر دو.....“

میں ناہید کو تسلی دے کر وہاں سے چلا تو آیا مگر خود میرا دل اندر سے انجان وسوسوں کا شکار تھا۔ یعقوب میٹشن میں کافی چہل پہل تھی۔ خبر عام ہو چکی تھی کہ ٹھیک چھ دن بعد رنگ اور کالی ایک بار پھر ایک دوسرے کے مقابل ہوں گے۔ بڑے احاطے میں سارنگا موسیٰ کے ساتھ مشق میں مصروف تھا۔ میں نے پہلی بار رنگا کے ہاتھ میں چاقو کی دھار کو بچکی کی طرح ادھر ادھر پلکتے دیکھا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ مسکرایا۔ ”آج اساجن..... تو بھی کچھ ہاتھ صاف کر لے..... موسیٰ تو اب بوڑھا ہوتا جا رہا ہے۔“ میں نے بہت انکار کیا مگر موسیٰ نے اپنا چاقو میری طرف پھینک دیا اور خود دائرے سے باہر نکل گیا۔ احاطے کے بزرگ استادوں نے بھی موسیٰ کو بوڑھا دیا اور سبھی اس شرارت میں شامل ہوتے چلے گئے، لیکن میں رنگا کے سامنے چاقو کیسے اٹھا لیتا؟ میں نے چاقو اس کے قدموں میں ڈال دیا۔ رنگا اب بھی مسکار رہا تھا ”جانتا ہوں تو میرے سامنے کھڑا نہیں ہونا چاہتا۔ پر مجھے ذرا دیر مشق تو کروا سکتا ہے نا..... ہر نیا حریف پچھلے کو کچھ نہ کچھ سکھا ہی جاتا ہے..... چل اب آجا..... میں نے تجھے اپنا خون معاف کیا.....“ میرے پاس اب کوئی چارہ باقی نہیں رہا تھا۔ مجبوراً میں نے رنگا کے قدموں میں پڑا چاقو اٹھا لیا، اور کرتے کی آستینیں چڑھا کر دائرے میں اکھڑا ہوا۔ کچھ دیر تک میں اور رنگا ایک دوسرے کو نظروں میں تولتے رہے اور پھر رنگا نے تیزی سے چاقو دائیں سے بائیں ہاتھ میں منتقل کیا۔ میں نے اچانک ہی غیر ارادی طور پر چاقو کو یوں منتقل ہوتے دیکھ کر رنگا کی بائیں کلائی پر ہاتھ ڈال دیا۔ شاید ہم میں سے کسی کو بھی مجھ سمیت میری اس پیش رفت کا اندازہ نہیں تھا کیونکہ یہ انتہائی اقدام تھا۔ رنگا کو بھی مجھ سے اس پھرتی کی توقع ہرگز نہ تھی اور ایک لمحے کے لیے اس کی کلائی میرے پنجے کی مضبوط گرفت میں آگئی لیکن تب تک رنگا کا چاقو میرے دوسرے ہاتھ میں منتقل ہو چکا تھا۔ کچھ دیر کے لیے شور مچاتا مجمع یک دم ساکت سا ہو گیا۔ اب میرا دایاں ہاتھ اور چاقو آزاد تھا اور جو فن چاقو بازی سے واقف ہیں وہ یہ بات خوب جانتے ہیں کہ حریف کا چاقو والا ہاتھ قابو میں کر لینے کے بعد اگر دایاں ہاتھ وار کے لیے کھلا ہو تو یہ ایک بونس پوائنٹ مانا جاتا ہے، اور وار کرنے کی آزادی بازی ختم بھی کر سکتی ہے، لیکن میری گرفت صرف لمحاتی ثابت ہوئی۔ رنگا نے لمحے کے

ہزاروں جھمپے میں میری چال سمجھ کر اپنی کلائی کو ایک زوردار جھٹکا دیا اور یہیں مجھ سے بنیادی غلطی ہوگئی۔ قاعدے کے مطابق مجھے فوراً ہی رنگا کے چاقو کی پینچ سے دور ہو جانا چاہئے تھا، لیکن مجھے ایک بل کی دیر ہوگئی اور چاقو کے کھیل میں ایک بل ہی سب کچھ ہوتا ہے۔ اگلے ہی لمحے رنگا کے چاقو کی تیز دھار میرے بازو کو کلائی سے اوپر کھینچ کر چلتی چلی گئی۔ خون کی ایک تیز پھوار نے رنگا کا چہرہ اور میرا سارا وجود رنگ دیا۔ ایک شور مچ گیا رنگا نے چاقو پھینک کر اپنا کرتہ دامن سے پھاڑا اور جلدی سے میرے بازو پر باندھ کر خون روکنے کی کوشش کی۔ موسیٰ نے لپک کر قریب پڑی زہر کش دوا کا پیرے میرے زخم پر کر دیا اور مجھے اپنے گھاؤ میں تیز مرچیں سی بھرتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ سارا رنگا نے فوراً گاڑی نکھوائی اور موسیٰ اور دوسرے کارندوں سمیت مرہم پٹی کے لیے مجھے قریبی کلینک لے جایا گیا۔ سبھی بے حد پریشان تھے لیکن رنگا اور موسیٰ کی بوکھلاہٹ سب سے سوتھی۔ بڑی مشکل سے واپس پہنچ کر میں نے ان دونوں کو تسلی دی کہ میں اب کافی بہتر ہوں اور ہفتہ دس دن میں یہ گھاؤ بھی بھر ہی جائے گا۔ لیکن انہیں بھلا میری تسلی سے آرام کہاں نصیب ہو سکتا تھا۔ رنگا بار بار خود کو ملامت کر رہا تھا کہ اس نے مجھے دائرے میں اترنے پر مجبور ہی کیوں کیا۔ وہ بار بار کف افسوس مل رہا تھا ”بڑی بھول ہوگئی رے سناں.....“ پر تو نے تو پہلا داؤ ہی ایسا کھیل دیا تھا کہ آدمی جیت اپنے نام کر لی تھی۔ رنگا کی کلائی پر آج تک کسی نے ہاتھ ڈال کر پچھہ بند کرنے کی مہلت نہیں پائی..... پر تو نے تو مجھے جکڑ ہی لیا تھا۔ پرواپس پلٹنے میں دیری کیسے ہوگئی تھی سے میں تو سمجھا تھا کہ اسی پھرتی سے تو ہاتھ واپس بھی کھینچ لگا.....“

میں نے اسے تسلی دی ”آپ خود کو ہلکان نہ کریں۔ کھیل میں تو ایسا ہو ہی جاتا ہے..... اور پھر جب چاقو اٹھایا لیا تو پھر کاٹ سے کیسا ڈر..... دھار کا تو کام ہی چیر دینا ہوتا ہے.....“

”ٹھیک کہتا ہے تو..... پر دھار اگر اپنوں کو چیر دے تو ایسی دھار کو پہلے سے کند کرنا ضروری ہوتا ہے.....“ میں نے غور سے سارا رنگا کی طرف دیکھا۔ ”دھار بھلا اپنے پرانے کا فرق کرنا کب جانتی ہے..... اپنے اگر ہاتھ روک بھی لیں تو پرانے کاٹ ڈالتے ہیں..... ہماری دنیا کا تو یہی اصول ہے نا.....“ میری بات سن کر رنگا اور موسیٰ دونوں ہی کسی گہری سوچ میں گم ہو گئے۔ موسیٰ سے پہلے رنگا بات کی تہہ تک پہنچ گیا۔ ”گلتا ہے آج تو بھی لاڈلی کی زبان بول رہا ہے..... یہ اسی کی بولی ہے“ میں نے اقرار میں سر ہلایا اور رنگا کو ناہید کے سبھی دوسووں اور پریشانیوں سے آگاہ کر دیا۔ جواب میں رنگا بہت دیر تک خاموش رہا۔

”تو نے اسے بتایا نہیں کہ یہ کالی دنیا ایک ایسی بند سڑگ کی مانند ہے جہاں اندر آنے کے ہزار پرواپسی کا ایک بھی راستہ نہیں ہے۔ وہ بھولی یہ بھی نہیں جانتی کہ زور کی اس دنیا میں صرف زور آور ہی جیتا ہے۔ جو تھک کر قدم واپس موڑے اسے یہ خود مار ڈالتے ہیں“ میں دھیرے سے بولا ”میں نے اسے یہ سب کچھ نہیں بتایا..... ابھی اس کے پاس ایک خواب باقی ہے کہ اس کا بابا کبھی نہ کبھی اس دنیا سے لوٹ آئے گا۔ اگر میں یہ سب بتا کر اس کا یہ خواب بھی توڑ دیتا تو پھر شاید وہ بالکل ہی ہار جاتی۔ اس کے پاس یہ آس باقی رہنے دیں.....“

ماحول پر یاسیت طاری ہونے لگی۔ رنگا اور موسیٰ میرے کمرے سے باہر نکلے تو رات آدمی سے زیادہ بیت چکی تھی، اور پھر دن اور رات آپس میں ملتے چلے گئے۔ میرا زخم تو ٹھیک نہ ہوا پر وہ دن آچہنچا جب کالی اور رنگا کو شاید آخری بار ایک دوسرے کے مقابل آنا تھا۔



## باب 28

ہم سب اپنی اپنی جگہ گاڑیوں میں یعقوب مینشن سے نکلے تو موسیٰ کچھ بجھا بجھا سا تھا۔ ہم سب زمر دھوہلی کے بیرونی میدان کی جانب روانہ ہو چکے تھے۔ میں نے موسیٰ سے اس کے دھیمے پن کی وجہ پوچھی تو اسے کچھ الجھا ہوا سا پایا۔ ”کچھ نہیں شہزادے..... رنگا استاد پچھلا پورا ہفتہ تیرے زخم کی پریشانی میں من لگا کر مشق نہیں کر پایا..... دراصل جب سے ناہید بیٹا جوان ہوئی ہے ویسے بھی اس کے اندر کا وہ رنگا کہیں کھو گیا ہے جو اپنے شکار پر جھپٹ کر اسے پہلے ہی وار میں ادھیڑ ڈالتا تھا۔ اب استاد صرف اس وقت وار کرتا ہے جب ضرورت ہوتی ہے..... اور کالی جیسے خبیث کے ساتھ مقابلہ کرتے وقت یہ دیری بہت نقصان دہ ثابت ہو سکتی ہے.....“ میں پریشانی سے موسیٰ کی بات سنتا رہا۔ موسیٰ کے کہنے کے مطابق چاقو بازی کے مقابلے میں انسان کے اندر مقابل کو مار دینے کی فطری جبلت (Killer instinct) کا ہونا بہت ضروری ہوتا ہے۔ اس کلر اسٹینٹ کے بغیر کوئی بھی اپنے مقابل کے سامنے ادھیڑا پڑ جاتا ہے اور رنگا کے اندر سے یہ حیوانی جبلت بیٹی کے جوان ہونے کے ساتھ ساتھ ختم ہوتی جا رہی تھی۔ اب وہ زیادہ تر اپنا دفاع کر کے مقابلے کو لمبا کرتا ہے اور حریف کے تھک جانے پر اسے کم سے کم نقصان پہنچا کر زیر کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اگر رنگا کا حریف کوئی عام چاقو باز ہوتا تو یہ سستی برداشت کی جا سکتی تھی لیکن آج اس کے مقابل کالی جیسا شاطر اور کائیاں حملہ آور تھا۔ موسیٰ کو یہی فکر کھائے جا رہی تھی کہ خدا نخواستہ آج کوئی انہونی نہ ہو جائے۔ بقول اس کے جب رنگا نے کالی سے اس کا یہ علاقہ چھینا تھا تب بھی رنگا نے مقابلہ بہت لمبا کھینچ دیا تھا اور وہ کالی کے چاقو کی زد میں آنے سے کئی بار بال بال بچا تھا۔

میں موسیٰ اور اسماعیل ایک گاڑی میں، جب کہ سارنگا ڈالے کے دیگر استادوں کے ساتھ اگلی گاڑی میں تھا۔ ہمارے پیچھے تین اور بڑی گاڑیاں بھی دیگر کارندوں کے ساتھ رواں دواں تھیں۔ کالی نے مقابلے کے لیے زمر دھوہلی کے باہر والے بڑے میدان کو چنا تھا۔ شاید وہ اس طرح رنگا پر کوئی نفسیاتی دباؤ بھی برقرار رکھنا چاہتا تھا۔ ہم صبح گیارہ بجے سے پہلے زمر دھوہلی کے بیرونی میدان میں پہنچے تو کالی اپنے ہر کاروں سمیت پہلے ہی وہاں موجود تھا۔ نواب صاحب اور پاشا بھی حویلی کے تمام عملے کے ساتھ باہر آ چکے تھے اور مجھے دور حویلی کی تفصیل پر بھی کچھ چہل پہل نظر آئی۔ شاید خانم اور فضلہ بھی منڈیر کی کسی بڑی درز سے یہ عجیب و غریب اور خونی مقابلہ دیکھنا چاہتی تھیں جس کی ہاریا جیت پر ان کی جدی ہشتی حویلی کے قبضے کا دارومدار تھا۔ کچھ ہی دیر میں میدان میں سفید قلعی سے ایک دائرہ ڈال دیا گیا۔ آج اس میدان میں رنگا اور کالی کی سرکار کی پوری کابینہ، ریٹائرڈ ٹائپ بزرگ استاد اور زیر زمین دنیا کے سبھی دادا مدعو تھے اور مقابلہ شروع ہونے سے پہلے وہاں ایک بہت ہجوم اکٹھا ہو چکا تھا۔ ایک بوڑھے استاد (Don) نے دائرے میں کھڑے ہو کر سارنگا کا دیا ہوا چیلنج پڑھ کر سنایا اور تصدیق چاہی۔ رنگا نے اثبات میں سر ہلایا تو اس نے مقابلے کے اصول پڑھ کر سنائے اور کسی بھی فریق کی جان جانے کی صورت میں کسی بھی خوں بہایا کو توالی کے حق کی نفی ظاہر کی۔ یعنی یہ کھیل زیر زمین کی سرکار کے رواج کے مطابق کھیلا جائے گا۔ آخر دائرے کے اندر کھڑے بزرگ نے اپنے ہاتھ میں پکڑا ایک سرخ رومال لہرایا اور رنگا اور کالی دائرے میں داخل



ہو گئے۔ بزرگ استاد نے ہوا میں تین بار رو مال لہرایا۔ سینیٹ اراکین نے صوفے سنبھال لیے اور ہاتھ اٹھا کر اجازت دی۔ بزرگ نے رو مال ہاتھ اونچا کر کے ہوا میں اچھال دیا۔ موسیٰ زور سے چلایا ”کچل ڈالو استاد۔۔۔۔۔“ میرے دل سے آواز نکلی ”یا اللہ رحم۔۔۔۔۔“ نواب اور حویلی کے باقی مرد اراکین اور علمہ حیرت اور پریشانی سے یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ یہ شاید ان کی زندگی کا سب سے حیرت انگیز دن تھا۔

چاقو نکالنے سے پہلے رنگا اور کالی میں زور کا مقابلہ ہوا۔ مجھے یوں لگا جیسے دو چٹائیاں اپنی اپنی جگہ جامد کھڑی ہوں۔ نہ تو رنگا اور نہ ہی کالی اپنی جگہ سے اونچ بھر بھی ہلے۔ دونوں کے ماتھے پر پسینے کی بوندیں پھٹکتی لگیں اور میں اتنے فاصلے سے بھی ان دونوں کے بازوؤں کی رگیں جھنجھنے کی آواز سن سکتا تھا۔ کالی کے اندر واقعی بڑا دم خم تھا کیوں کہ سارا رنگا استاد کے سامنے اتنی دیر تک پانا کسی کے بس کی بات نہیں تھی۔ میرے اندر موسیٰ کی ڈوبتی آواز ابھری ”استاد کو اپنے اندر بھر سے مار دینے کی حیوانی جبلت پیدا کرنا ہوگی۔۔۔۔۔ ورنہ کالی انہیں مار دے گا۔۔۔۔۔“ زور کا مقابلہ بنا کسی نتیجے کے ختم ہو گیا۔ ایک کارکن گول طشت میں دو چاقو رکھ کر بزرگ رہنما کے پاس آیا۔ بوڑھے استاد نے دونوں چاقوؤں کو چھو کر اپنی دعا اور اجازت ظاہر کی۔ طشت رنگا اور کالی کے پاس لے جایا گیا جنہوں نے ایک ایک چاقو اٹھا لیا اور اسے چوم کر کھٹکے سے کھول لیا۔ ہم سب یوں دم سادھے کھڑے تھے جیسے اگر کسی نے بھی ذرا زور سے سانس بھی لی تو یہ خواب بکھر جائے گا۔ دونوں حریفوں نے کچھ دیر تک فضا میں تیزی سے چاقو لہرا کر اور پینترے بدل کر ایک دوسرے کے داؤ کا اندازہ لگانے کی کوشش کی اور پھر ایک ایک کالی نے ہوا میں اپنے اچھالے چاقو کو دوسرے ہاتھ تک پہنچنے سے قبل ہی ہوا میں دوبارہ دیو بج لیا۔ عام حالات میں حریف دائیں سے بائیں ہاتھ تک چاقو کے سفر کا وقت شمار کر کے پینترے بدلتا ہے لیکن کالی کی تیزی دیکھ کر میں خود بھی ششدر رہ گیا۔ اگر عین لمحے پر رنگا اپنے اوپری جسم کو فوراً پیچھے نہ جھکا لیتا تو کالی کا چاقو ضرور اس کے سینے کے آر پار ہو جاتا۔ فضا میں کالی کے حمایتیوں کے نعرے اور رنگا کے ساتھیوں کی بے چین سرگوشیاں ابھریں۔ موسیٰ نے بے چینی سے اپنی انگلیاں جٹائیں ”دھیان سے رنگا استاد“ اس کی اپنے آپ سے کی گئی یہ سرگوشی صرف میں ہی سن سکتا تھا۔ رنگا نے خود کو اگلے ہی پل سنبھال لیا، اور اس نے نظروں نظروں میں کالی کو داد بھی دی، اور ابھی کالی رنگا کی نظروں کی داد ہی سمیٹ رہا تھا کہ رنگا کا ہاتھ اسی تیزی سے لہرایا کہ کالی کو جھکنے کا وقت بھی نہیں ملا مگر رنگا نے شاید جان بوجھ کر چاقو کی نوک کو صرف چھونے کی استعداد تک بڑھایا تھا۔ زیادہ قریب آنے میں کالی کے چاقو کی زد میں آنے کا خطرہ بھی اس کے پیش نظر ضرور ہوگا، لیکن اس نے تپتے وار میں بھی وہ کالی کے کرتے میں سینے کی جگہ ایک بڑا سا سوراخ کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اب چیخنے کی باری رنگا کے حامیوں کی تھی۔ موسیٰ زور سے چلایا ”واہ استاد واہ۔۔۔۔۔ کاٹ ڈالو اس حرام خور کو یہیں۔۔۔۔۔“

اپنے پھٹے کرتے کو دیکھ کر کالی کا چہرہ سرخ ہو گیا اور اس نے پے در پے رنگا پر کئی آڑھے ترچھے وار کیے۔ دور سے ہمیں فضا میں چاقو کی دھار دھار لپکتی نظر آ رہی تھی، لیکن رنگا اس بار پوری طرح ہوشیار تھا۔ اس نے خود کو دائیں بائیں جھکائیاں دے کر بڑی مہارت سے کالی کے چاقو کی پہنچ سے دور رکھا اور پھر وقت جیسے قلم سا گیا۔ دونوں حریف ایک دوسرے پر چھپتے اور وار کرتے رہے۔ گھنٹہ بھر ہونے کو تھا۔ دونوں کے چاقو کی نوکیں اب ایک دوسرے کو چھونے لگی تھیں۔ فضا میں دونوں کے خون کے چھینٹے تھوڑی تھوڑی دیر بعد اچھل جاتے تھے۔ دونوں ہی لہو لہان ہو چکے تھے ہر گھبراؤ پر نواب صاحب اپنی آنکھیں میچ لیتے تھے اور پاشا صاحب کی تسبیح اور زیر لب پھونکی جانے والی دعائیں تیز تر ہو جاتی تھیں۔ موسیٰ اب باقاعدہ

انتہا کرنے لگا تھا ”استاد..... بس کاٹ ڈالو.....“ لیکن کالی بھی رنگا کے وار کی زد میں کب آنے والا تھا۔ جھکن دونوں کے چہروں سے واضح تھی اور دونوں کی نظر ایک پل کے لیے بھی دوسرے حریف سے نہیں ہٹتی تھی۔ دفعۃً کالی نے اپنا چاقو ابتدائی حملے کے انداز میں ہی دوبارہ فضا میں اچھالا۔ شاید وہ اس بار بھی رنگا کو بائیں ہاتھ کا جھکا دے کر چاقو کو دائیں ہاتھ سے ہی فضا میں دیوبج کر پھر سے وہی اپنا آزمودہ نسخہ آزمانا چاہتا تھا لیکن جانے رنگا نے اس کی آنکھوں میں کیا پڑھ کر اپنی زندگی کا سب سے بڑا جوا کھیلنے کا فیصلہ کر لیا۔ ٹھیک جس طرح میں نے رنگا کے چاقو فضا میں بلند کرتے ہی اپنا آزاد پنجہ رنگا کی کلائی پر ڈال دیا تھا رنگا نے بھی اپنا پنجہ کالی کی اس کلائی پر ڈال دیا جس کی طرف اس نے چاقو اچھالا تھا شاید کالی کے ذہن میں بھی یہی چال تھی کہ اس بار وہ رنگا کو دھوکہ دے کر چاقو واقعی دوسرے ہاتھ میں تمام کر رنگا کو کاری ضرب لگانے میں کامیاب ہو جائے گا لیکن اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوگا کہ رنگا اس کا وہی ہاتھ دیوبج لے گا۔ کالی کا چاقو اور رنگا کا پنجہ ٹھیک ایک ہی وقت میں کالی کی ہتھیلی اور کلائی سے ٹکرائے۔ کالی کی کلائی رنگا کی گرفت میں آئی اور فضا میں ہڈی ترخنے کی آواز گونجی۔ کالی کے چہرے پر شدید اذیت کے آثار نظر آئے لیکن رنگا کی گرفت سے اپنی کلائی نکالنا اس کے لیے ناممکن ہو چکا تھا۔ رنگا کی نظر میری نظر سے ٹکرائی اور اس نے اپنی بائیں آنکھ دبا دی۔ جیسے کہہ رہا ہو کہ اسے میرا دواؤ اب بھی یاد ہے۔

دوسرے ہی لمحے اس نے کالی کی کلائی موڑ دی اور اس کے پنجے میں جکڑا چاقو ناکارہ ہو گیا۔ جھوم چلا رہا تھا ”کاٹ ڈال رنگا استاد..... ختم کر دے..... مار ڈال اسے.....“ رنگا کالی کا بازو پشت پر موڑنے کے بعد اب خود اس کے عقب میں یوں کھڑا تھا کہ اس کا چاقو کالی کی شررگ کو چھو رہا تھا۔ جھوم کا شور بڑھتا گیا رنگا کے حمایتی چیخ چیخ کر اسے کالی کی شررگ پر چاقو پھیر دینے کی دہائی دے رہے تھے۔ کالی نے ایک نظر سب کو دیکھا، اور پھر اس نے آنکھیں بند کر کے زیر لب کچھ پڑھا۔ میرا دل زور سے دھڑکا۔ کالی نے بھی آنے والی فضا کے استقبال میں اپنی آنکھیں موندھ لیں اور دوسرے ہی لمحے رنگا نے کالی کی شررگ پر اپنے چاقو سے عمر بھر کے لیے ایک گہرا نشان ڈال کر اسے لات مار کر سفید دائرے سے باہر دھکیل دیا۔ کالی مقابلہ ہار چکا تھا لیکن رنگا نے اس کی جان بخش دی تھی۔ کالی دائرے کے باہر ہی جھکن اور زخموں سے چورنڈہ حال سا پڑا ہوا پھر سب سے پہلے موسیٰ چلاتے ہوئے رنگا کی طرف دوڑا اور اسے اپنے بازوؤں میں اٹھالیا پھر تو یکے بعد دیگرے سبھی رنگا کی طرف لپکے اتنا شور مچا کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ نواب صاحب نے شکرانے کے طور پر وہیں اپنے ہاتھ فضا میں بلند کر دیے اور پاشا صاحب کی تسبیح رک گئی۔ خود سارنگا کی حالت بھی ٹھیک نہیں تھی اور اس کے زخموں سے تیزی سے خون بہہ رہا تھا۔ نواب صاحب نے احتیاط کے پیش نظر اپنے ذاتی معالج کو ایسویٹنس سمیت پہلے ہی سے وہاں بلا رکھا تھا، لیکن رنگا واقعی اعلیٰ ظرف دشمن تھا۔ اس نے خود سے پہلے معالجین کو کالی کی طرف بھیجا۔

سارنگا کو فوراً حویلی کے مردانے میں منتقل کر دیا گیا لیکن رنگا کی حالت سنبھلنے میں تین روز لگ گئے۔ نواب صاحب کے معالجین نے موسیٰ کو آخری لمحے تک یہی مشورہ دیا کہ وہ رنگا کو فوراً کسی بڑے ہسپتال لے جائے لیکن اڈے کی مصلحتوں کے تحت موسیٰ نے حویلی میں ہی علاج جاری رکھنے پر زور دیا۔ وہ تو رنگا کو لے کر فوراً یعقوب مینشن پہنچنا چاہتا تھا لیکن نواب صاحب نے باقاعدہ ہاتھ جوڑ کر موسیٰ کو رنگا کا علاج زمر حویلی میں ہی جاری رکھنے پر مجبور کر دیا۔ تیسرے روز ناہید کی بے انتہا ضد پر اسماعیل اسے بھی زمر حویلی لے آیا۔ حالانکہ اسے سارنگا کی شدید ناراضگی کا بھی علم تھا

لیکن اس سے ناہید کی حالت بھی نہیں دیکھی گئی۔ ناہید نے رنگا کو چپٹوں میں جکڑا یوں بستر پر پڑے دیکھا تو وہ پھوٹ پھوٹ کر روتی ہوئی باپ کے گلے لگ گئی۔ رنگا اسے روکنا ہی رہ گیا۔ ”یہ حرام خور ساعیل کبھی نہیں سدھرے گا۔۔۔۔۔ اب کیوں روتی ہے ری۔۔۔۔۔ لاڈلی کا بابا ابھی بالکل ٹھیک ہے۔۔۔۔۔ بس چند کھروچیں ہی تو آئی ہیں۔۔۔۔۔“ لیکن ناہید کی آنکھوں کا ساون اب تھمے کا نام نہ لیتا تھا وہ سارنگا کے بستر سے ہٹنے کے لیے ہرگز تیار نہیں تھی۔ بڑی مشکل سے زنانے سے خانم کو بلوا کر اسے رات گزارنے کے لیے ان کے ساتھ بھیجا گیا۔ سارنگا کی کچھ دیر کے لیے آنکھ لگ گئی تو میں بھی دبے پاؤں باہر حویلی کے دالان میں آ گیا۔ رات کے اندھیرے میں چمکتے تارے اور کھلا آسمان بہت بھلا محسوس ہو رہا تھا میرے ذہن میں ایک عجیب سا خیال آیا کہ یہ رات نہ ہوتی تو تاروں کو بھی یہ چمک نصیب نہ ہوتی۔ ہم ظاہر پرست انسان ہمیشہ چاند اور ستاروں کی خوبصورتی کو سراہتے ہیں کبھی کسی کی یہ نظر اس رات کی سیاہی پر کیوں نہیں پڑتی جس کے دان کے بغیر یہ جھرمٹ یہ آنچل کبھی جگمگا ہی نہ پاتا۔ شاید دنیا کی ہر چمک کسی اندھیرے کی قربانی کی مرہون منت ہے۔ میں انہی سوچوں میں گم چلا ہوا نہر کی پرلی جانب جا نکلا تب مجھے خیال آیا کہ میں چلتے چلتے زنان خانے کے عقب میں بہتی نہر کی شاخ کے قریب آپہنچا ہوں۔ حویلی کے محافظوں نے بھی مجھے ٹوکنے کی کوشش نہیں کی کیونکہ ان کی نظر میں اب ہم سب بھی حویلی کے ہی فرد تھے لیکن خود مجھے تو احساس تھا کہ حویلی کی چار دیواری کے اندر کی حد بندیوں کا خیال رکھنا اب پہلے سے بھی کہیں زیادہ ضروری ہے میں جلدی سے واپسی کے لیے پلٹا اور ابھی میری نظر نہر کے قریب بھیجی سنگ مرمر کی سل کے اوپر گم سمی ہٹھی فغفہ کے ہولے پر پڑی۔ وہ میری آہٹ سن کر چونکی ”کون ہے وہاں۔۔۔۔۔“ پہلے میں نے سوچا کہ خاموشی سے پلٹ جاؤں کیونکہ اس طرح رات کی تنہائی میں کوئی مجھے فغفہ کے ساتھ باتیں کرتا دیکھ لے تو نہ جانے کیا سوچے گا، لیکن پھر بے اختیار میں جواب دے بیٹھا ”میں آیاں ہوں۔۔۔۔۔“ میں چند قدم بڑھ کر اس کے سامنے آ گیا۔ اس کی آواز میں ہلکی سی شرارت تھی۔

”کیا آپ اب تک راتوں کو جاگ کر زمر حویلی کی حفاظت کرتے ہیں۔۔۔۔۔“ میرے ہونٹوں پر بھی مسکان آ گئی ”اور کیا آپ ابھی تک اندھیرے میں چھپ کر کتابیں تلاشتی ہیں۔۔۔۔۔“ وہ بھی ہنس پڑی۔ اس کی ہنسی اور پاس بہتی نہر کے پانی کی جھنکار میں کتنی مماثلت تھی ”ہنستی رہا کریں۔۔۔۔۔ اچھی لگتی ہیں۔۔۔۔۔“ ہم سنگ مرمر کی سل پر بیٹھ گئے۔ اس نے غور سے میری جانب دیکھا ”اب مجھے پتہ چلا کہ آپ اپنے وجود میں اتنی حیرتیں سمیٹے کیسے پھرتے ہیں۔ آپ کے آس پاس سبھی لوگ جو اتنے حیران کن ہیں۔۔۔۔۔ میں نے اس روز جو بھی دیکھا وہ ناقابل یقین تھا۔ سنا تھا کہ پرانے دور میں گلڈبرنز ہوا کرتے تھے جنہیں بادشاہ وقت کی تفریح کی خاطر اکھاڑوں میں اتارا جاتا تھا۔ میں وہ مقابلہ دیکھتے ہوئے ٹھیک اسی دور میں پہنچ گئی تھی لیکن آیاں۔۔۔۔۔ مجھے آپ کی بہت فکر ہو رہی ہے۔۔۔۔۔ یہ سب بہت خطرناک ہے۔ اور آپ کے بازو پر کلائی کے قریب یہ زخم کیسا ہے۔۔۔۔۔ ضرور یہ بھی ایسی ہی کسی مہم جوئی کی یادگار ہوگا۔۔۔۔۔ یہاں سے جاتے وقت تو آپ کا بازو بالکل ٹھیک تھا۔۔۔۔۔“ میں نے بات ٹالنے کے لیے اس سے سوال کیا ”لیکن آپ یہاں کیا کر رہی ہیں اتنی رات گئے۔۔۔۔۔“

”بس۔۔۔۔۔ نیند نہیں آرہی تھی۔ ناہید کو مومو نے آج اپنے کمرے میں ہی روک لیا تھا۔ وہ بڑی مشکل سے سوئی ہے۔ اس لیے میں باہر آ گئی ورنہ مومو سے باتیں کر کے وقت بتاتی۔۔۔۔۔“

کچھ دیر کے لیے ہم دونوں خاموش ہو گئے۔ خاموشی صرف باتیں ختم ہو جانے کے بعد ہی دہنیں آتی۔ کبھی کبھی جب کہنے کے لیے بہت